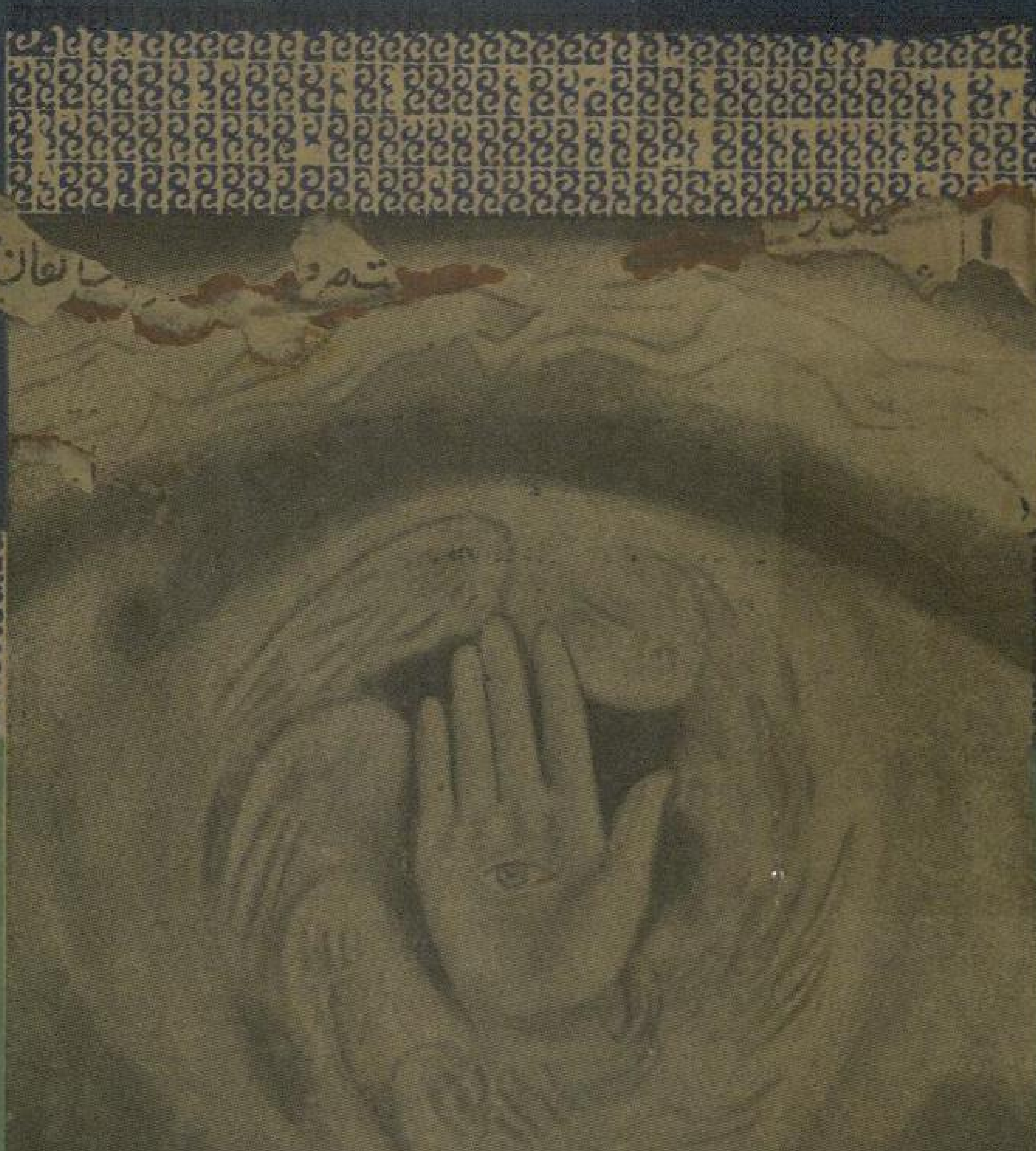
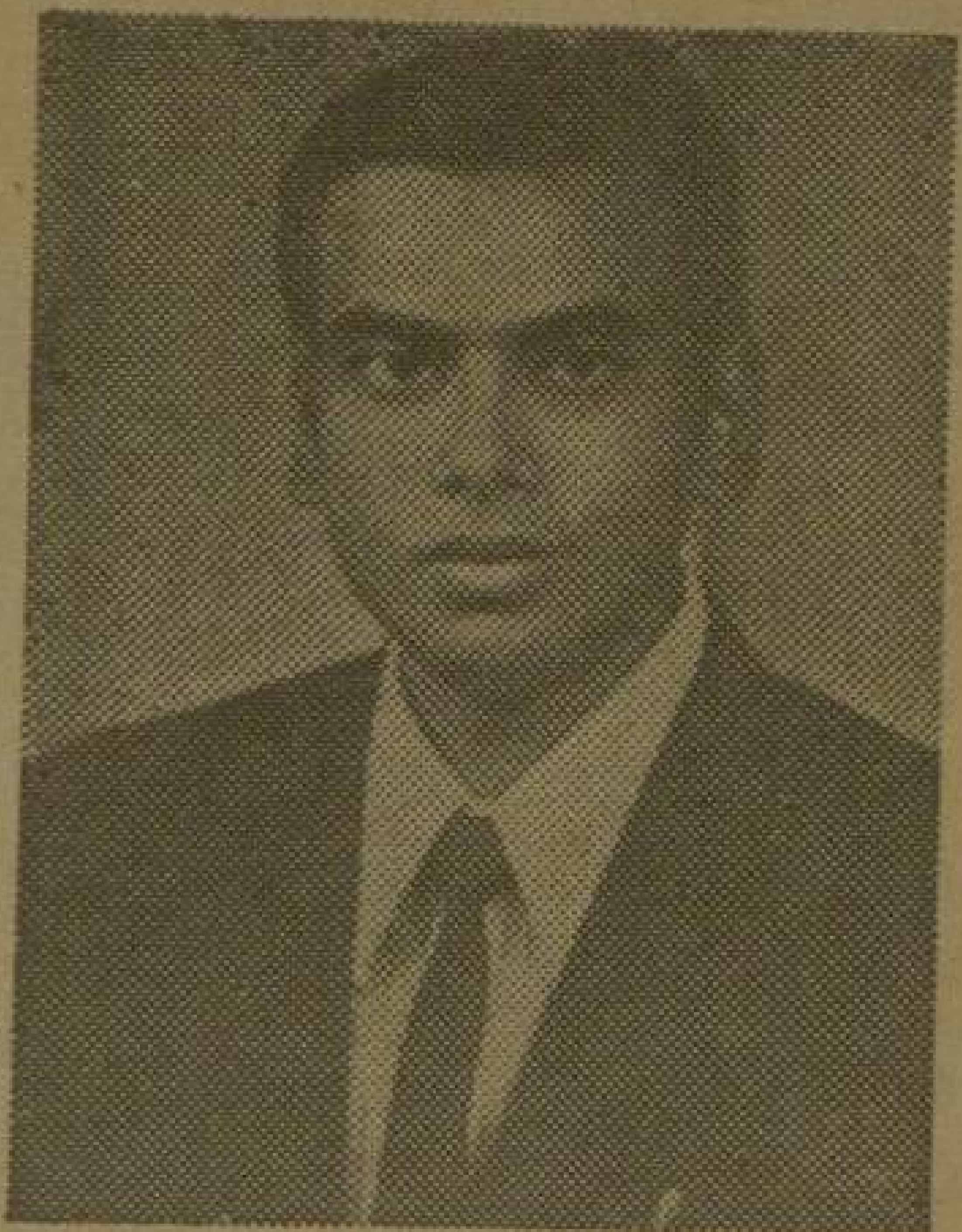
لفظ و پیکر



ایم



نام :- محمد ابو نصر۔

قلمی نام :- ایم۔ اے۔ نصر۔

مقام پیدائش :- دولت پور، حاجی پور، ویشالی (بہار)۔

تاریخ پیدائش :- ۴ / مارچ ۱۹۴۸ء۔

تعلیم :- بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے (گولڈ مڈلسٹ)۔ ریسرچ اسکالر۔

مشغلہ :- تخلیق، تحقیق، تنقید۔

مطبوعات :- چراغِ راہ۔ لفظ و پیکر۔

زیرِ ترتیب :- مغربی بنگال میں اردو افسانے۔

رسالۂ برزخ (صادق علی شاہ) ترتیب و تنقید۔

جاوید نہال۔ فن و شخصیت۔

چند ادبی شخصیتیں۔

تخلیق، تحقیق، تنقید

لفظ و پیکر

ایم۔ اے۔ نصرؔ ایم۔ اے (گولڈمڈلسٹ)

نقش اوّل :- ۱۱۰۰
سالِ اشاعت :- ۱۹۷۶ء

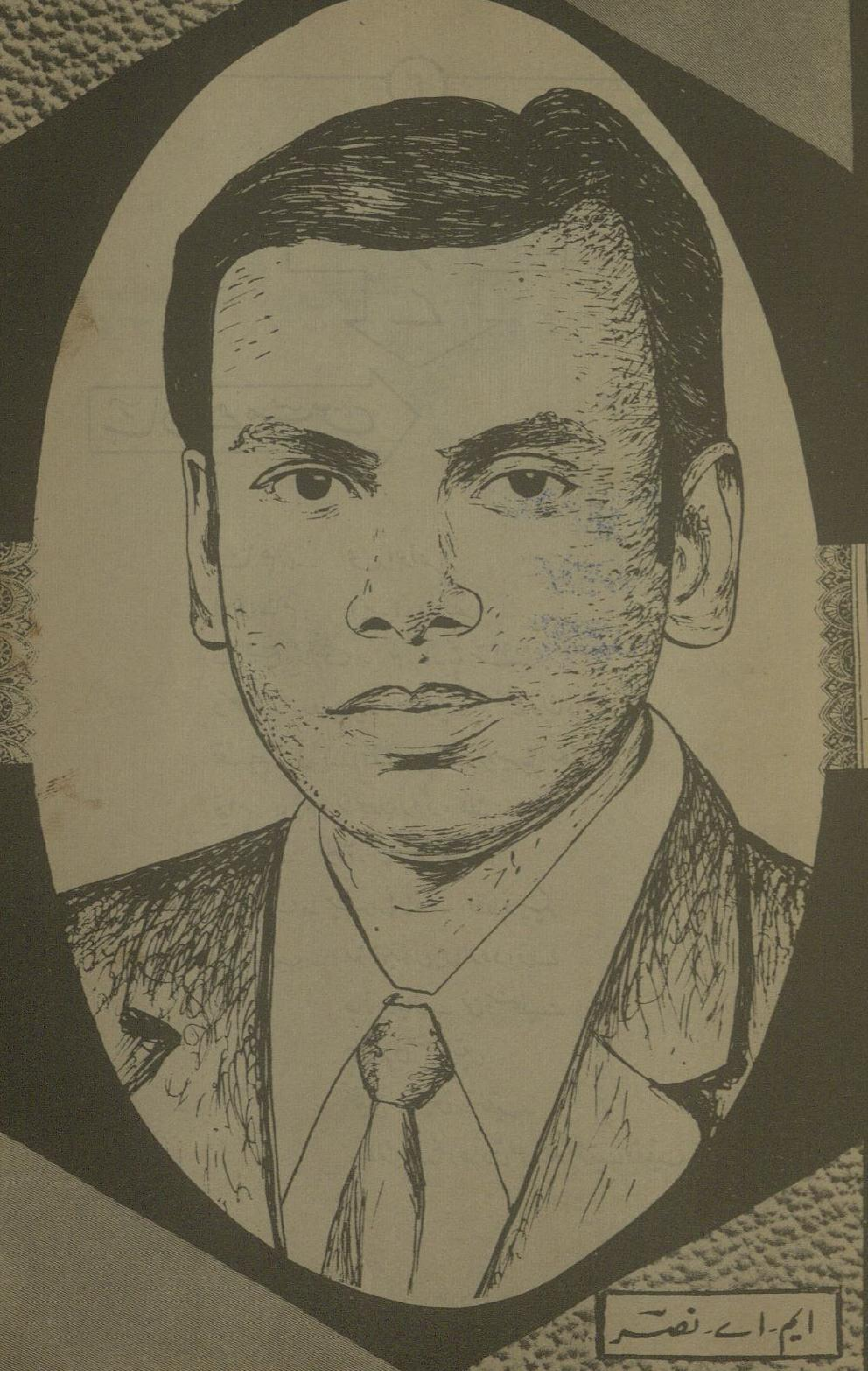
قیمت :-

عام ایڈیشن :- ے
لائبریری ایڈیشن :- روپے
ڈیلکس ایڈیشن :- روپے

خوشنویس :- اسلام قمری، کلکتہ
آرٹسٹ :- مظفر حسین مانپوری
سرورق :- خلیل جبران

مطبع :-
فوٹو آفیسٹ پرنٹرس
۳/۱۰ تال بگان لین، کلکتہ

ناشر
وارثی پبلیکیشن
۲۳ برابورن روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱



ایم۔اے۔نصر

مصنّف کے بارے میں

نام :- محمد ابونصر

ادبی نام :- ایم۔ اے۔ نصر

تاریخ پیدائش :- ۴ / مارچ ۱۹۴۸ء

وطن :- دولت پور، حاجی پور، ضلع ویشالی (بہار)

تعلیم :- بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر)

قیام :- ۲۴ برابورن روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱

مشغلہ :- تخلیق، تحقیق، تنقید

تصانیف :- چراغ راہ - لفظ و پیکر

زیر ترتیب :- مغربی بنگال میں اردو افسانے

جاوید نہال ۔ فن و شخصیت

چند ادبی شخصیتیں

تخلیق، تحقیق، تنقید

رسالۂ برزخ (صادق علی شاہؒ) ترتیب و تنقید

انتساب



بصد خلوص و احترام

ڈاکٹر جاوید نہال

کے نام

جن کی شخصیت میرے لئے
ایسے چراغ کی طرح ہے۔
جس کی روشنی میں میرا ادبی
سفر جاری ہے اور جاری رہے گا۔

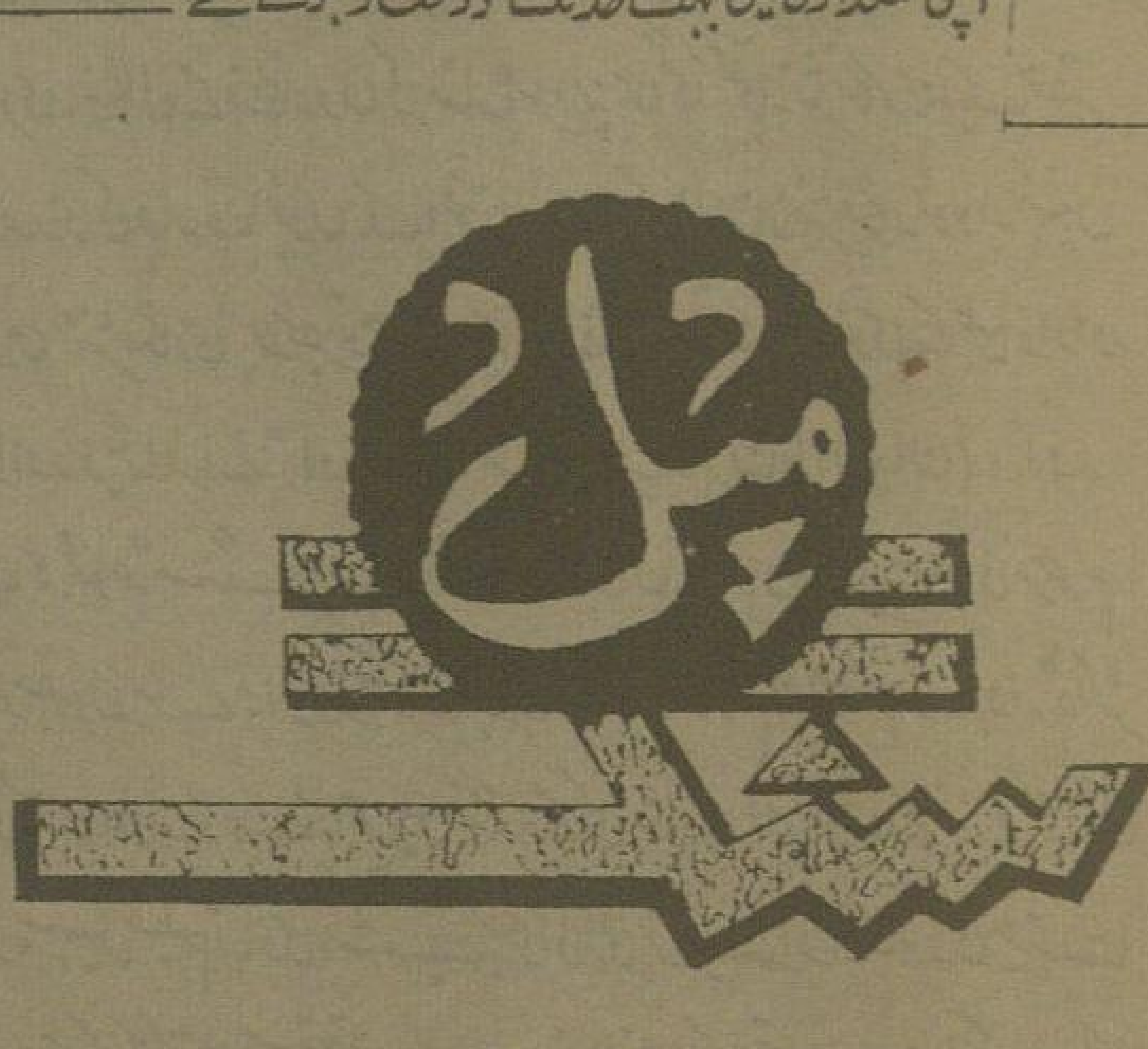
ایم۔ اے۔ نصرؔ

ترتیب



اُردُو اَدَب کی جو بھی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ اور جو تاریخیں مرتب کی جائیں گی۔ وہ تب ہی مکمل کہی جا سکیں گی۔ جب ان میں، اردو شعر و ادب کے ارتقا میں، بنگال کے کام کا، کوئی ذکر ہو گا۔ بنگال میں اردو، اویں صدی ہی میں آ گئی تھی۔ اور جب مسلمانوں نے بنگال کو فتح کیا اور لکھنوتی ان کی راجدھانی بنی تو لکھنوتی اور پنڈوا (مالدہ) مخلوط تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گیا۔ اور صوفیائے کرام کی آمد کی وجہ سے کھڑی بولی، فارسی اور بنگلہ کے خلط ملط ہونے۔ اور آسان و زود فہم ہونے کی وجہ سے عوام میں مروج ہو گئی تھی۔ ۱۸ویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں مرشد آباد، اردو ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا ـــــ جو بنگال کا دار السلطنت تھا۔

آمادۂ زوال سلطنت مغلیہ کے تاجداروں کے اختیارات دھیرے دھیرے سکڑتے سمٹتے جا رہے تھے۔ دور افتادہ صوبوں کا برائے نام، ان سے ناتا رہ گیا تھا۔ بنگال کے نوابین اپنی عملداری میں بہت حد تک خود مختار ہو گئے تھے ـــــ دلّی کی تباہی و بربادی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی ہجرت کی بھی داستان شروع ہوتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے قافلے، اجڑی ہوئی دلّی سے لکھنؤ اور دوسرے شہروں کی طرف چل پڑے



پڑے۔ کچھ نے لکھنؤ میں پناہ لی، بعض نے عظیم آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور بعض مرشد آباد آگئے۔ جہاں کے نوابین نے (فراخدلی کے ساتھ) انہیں خوش آمدید کہا اور فیاضانہ برتاؤ کیا، ان کی سرپرستی کی۔ نوابین کی سرپرستی کی وجہ سے مرشد آباد بھی اردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ جہاں اماتی، قدرت اللہ قدرت، باقر مہدی مخلص، درد مند فقیہہ، ماشاء اللہ مصدر اور پھر مصدر کے بیٹے انشاء اللہ خاں انشاء جیسی عظیم المرتبت ادبی شخصیتیں ابھر کے سامنے آئیں۔ مرشد آباد کے ساتھ ہوگلی کے افق پر بھی شاعروں کی کہکشاں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے ——— ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء میں، جب جان گلکرسٹ کی ایما پر لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد رکھی۔ تو ادب کے نقشہ پر بنگال ——— اردو کا پہلا نثری مرکز کے روپ میں ابھرا گویا ۱۹ ویں صدی ہی سے بنگال بھی، ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح، اردو کے بکھرے ہوئے گیسو سنوارنے میں لگ گیا تھا۔ اور فورٹ ولیم کالج کی مقبول انام نثری داستانوں کے اثر سے شمالی ہند میں بھی نثر درخور التفات سمجھی جانے لگی۔ اس طرح نثر نگاری کا باضابطہ چلن ہوا۔

اردو نثر کا پہلا اہم مرکز ہونے کے باوجود، بیسویں صدی میں بنگال کی سرزمین "نثر" کے لئے سنگلاخ ہوتی گئی۔ انیسویں صدی میں یہاں ایک ہی ایسی شخصیت ابھری، جو بنیادی طور پر نثر نگار تھی۔ اور وہ شخصیت، سید محمد آزاد کی تھی۔ شہباز، نثر نگار کم، شاعر اور صحافی زیادہ تھے۔ اور ناسخ بھی شاعری ہی پر تمام عمر فخر کرتے رہے۔ مگر "تذکرہ شعراء" ان کی شہرت کو دوام بخش سکا۔ جو ان کا نثری کارنامہ ہے۔ بیسویں صدی میں شاعری، بنگال کے فنکاروں کی متاعِ عزیز بن گئی تھی۔ نثر نگاری ایک حقیر صنف سمجھی جاتی رہی۔ اور اس صدی کی چار دہائیوں تک افق ادب پر کوئی ممتاز نثر نگار نمودار نہیں ہوا۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں "نثر نگاری" پر پھر توجہ دی جانے لگی۔ سالک لکھنوی کے طبع زاد اور ترجمہ افسانوں کا مجموعہ "عذرا اور دیگر افسانے" اور یونس احمر، قیصر نشاط (نشاط الایمان) اور خلیل الرحمٰن لکھنوی کے افسانوں کا مجموعہ "سنگ ریزے" شائع ہوا۔ ان کے علاوہ حسرت نعمانی مرحوم کے مقالات نگار میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ اور ڈاکٹر صابر خاں ضبط کا نام بھی مشہور ہوا۔ ڈاکٹر صابر خاں نے اردو ادب کو، کئی عمدہ افسانے دیئے، جن میں بنگلہ کے کئی شاہکار افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ جمیل مظہری، قاضی عبد الغفار، سہیل عظیم آبادی، شریف چکوالی بھی ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے، اور ل۔ احمد اکبر آبادی کی کلکتے میں مستقل سکونت نے "نثر" کو مقبولیت عطا کی۔ اور ایک

بار پھر

بار پھر اردو نثر چپکے چپکے اپنے "نثری گہوارے" میں قدم جمانے لگی۔

آزادی کے بعد اور بھی کئی نام ابھر کے سامنے آئے۔ صادق القادری مرحوم، احمد سعدی، سہیل ادیب، کی کہانیاں مقبول ہونے لگیں۔ یونس احمر، شین مظفر پوری، کلام حیدری اور جاوید نہال نے اپنا افسانوی سفر تیزی سے شروع کیا۔ اور افسانوی ادب پر چھا گئے۔ ترقی پسند ادب کلکتے میں بھی، بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ قیصر نشاط، نئے نام سے آئے اور نشاط الایمان کی کہانیاں، جریدوں میں شائع ہونے لگیں۔ نثر کے فروغ کے لئے ماحول سازگار ہوا۔ اور اس کے چوکھٹے میں دلفریب ادبی تصویریں سجنے لگیں ——— مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جتنے جید صحافی تھے۔ اتنے ہی بڑے ادیب بھی ہوئے ہیں۔ روزنامہ ہند سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اجالا ہفتہ وار نکالا۔ اس ہفتہ وار اخبار نے جاوید نہال احمد سعدی اور ادیب سہیل کو آگے بڑھایا۔ اس دور میں راشد القادری نے بھی نثر کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا۔ اور آسنسول سے افسانہ نگار کی حیثیت سے سہیل واسطی، عابد ضمیر اور شمس ندیم سامنے آئے۔ بنگال میں اردو افسانے کی مقبولیت دن بہ دن بڑھتی گئی۔

دراصل آزادی کے بعد بنگال میں اردو شاعری کے ساتھ صنف نثر کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا۔ اور آزادی کے بعد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے والے نثر نگاروں کی کوششوں کی وجہ سے "نثر" کی ترقی اور وسعت کے لئے فضا سازگار ہوئی۔ اور نئی نسل کے اذہان پر ان کا گہرا اثر مرتب ہوا۔ یہ خیال بالکل باطل ہو گیا کہ "شاعری" ہی کسی کو عالم اور دانشور بناتی ہے۔ اس طرح بٹوارے کے بعد، یہاں اردو ادب میں "نثر" بھی ایک وسیع صنف سمجھی جانے لگی۔ اور اس عہد کے نثر نگاروں نے نئی نسل کی ایک کھیپ تیار کی۔ نئی نسل کے نثاروں نے بالواسطہ یا براہ راست اپنے بزرگ ادیبوں کا اثر قبول کیا۔ اس نئی کھیپ سے، اس ایچمدان کا بھی تعلق ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ "دنیائے ادب" میں میری حیثیت نووارد کی سی ہے۔ کیونکہ کسی ادیب کی چھ سات سال کی زندگی، بہت ہی مختصر ہوتی ہے۔ میری ادبی زندگی بھی مختصر ہے۔ ان چھ سات برسوں میں ادب کے بہت سے اتار چڑھاؤ سے مجھے گزرنا پڑا ہے۔ اور ابھی نہ جانے کتنے نشیب و فراز سے، اور بھی گزرنا پڑے گا۔ میرا ادبی سفر ابھی شروع ہوا ہے، منزل بہت دور ہے۔ لیکن میں ——— اپنی بساط کے مطابق، خلوص و صداقت کو عصا بنائے ہوئے، منزل کی جانب رینگ رہا ہوں۔ وقت

نے سہارا دیا

نے سہارا دیا تو میری رفتار بھی تیز ہوگی۔ اور اسی منزل کی جستجو میں "شوق بے پروا" اور "جرأت رندانہ" سے کام لیکر، میں نے اپنی مختصر ادبی زندگی ہی میں، اپنے چند مقالات کو یکجا کر کے "لفظ و پیکر" کی شکل میں، آپ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کی ہے۔ میں نے اسے "جرأت رندانہ" اس لئے کہا ہے کہ آج کی کاد بازاری اور کاغذ کی ہوش ربا گرانی اور متعلقہ چیزوں کی کمیابی کے وقت، کسی کتاب کی اشاعت، جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں۔ منزل کو پانے کی میرے دل میں جو تڑپ ہے، وہی مجھے گام گام پر سہارا دے رہی ہے۔

"لفظ و پیکر" میرے چند مقالوں کا مجموعہ ہے ــــــــــ "امیر خسرو کی ہندوی شاعری" میں ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر حضرت امیر خسرو کی ہندوی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جن کی مادری بولی، بانگڑو یا ہریانوی تھی۔ خسرو نے اپنی ماں کی "بولی" میں بھی شاعری کی تھی۔ جو ہندوی شاعری سے عبارت ہے۔ "خالق باری" ان کی خالص تصنیف نہ سہی، مگر اس میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل ہیں، جو امیر خسرو کی ہیں۔ اور ان ہی بعض ہندوی دوہرے، مکرانیاں، پہیلیاں اور غزل کی بنیاد پر میں نے انہیں اردو کا اگر نہیں تو، بانگڑو (ہندوی) کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ "مغربی بنگال میں اردو کا سفر" میں مغربی بنگال کے نمائندہ، مشہور اور نئے ابھرتے ہوئے فنکاروں کی اردو خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اور ادب میں انکی ادبی حیثیت، متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالے میں پہلی بار رست کلکتوی کا مکمل ادبی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اور مطبوعہ، مگر نایاب "دیوان لطف" اور "مخانۂ بدر" پر تبصرہ بھی۔ گویا مغربی بنگال کا تابناک ماضی لوٹ آیا ہے اور شاندار مستقبل افق ادب پر قطب کی طرح ابھر آیا ہے۔

ہندوستان اور خصوصاً بنگال کے مشہور ادیب ڈاکٹر جاوید نہال کی افسانہ نگاری پر میرا مقالہ نذرِ عقیدت ہے، اس قابل قدر شخصیت کے لئے، جس نے میری ذہنی تربیت کی۔ اور مجھے ابو نصر سے ایم۔اے نصر بنایا۔ جن کی قدم قدم پر رہنمائی کے بغیر میں کچھ نہیں بن پاتا۔ استاذی محترم کو نئی نسل افسانہ نگار کی حیثیت سے بھولنے لگی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے تحقیقی مقالہ "مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" اور اسی کی بنیاد پر "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" جیسی عظیم تصنیف میں۔ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ دس سال تک کوئی کہانی نہیں لکھی۔ گو ان کی ادبی زندگی کی ابتدا

افسانہ نگاری ہی سے ہوئی تھی۔ میں نے اس مقالے میں، انکی گوناگوں شخصیت کے اس گوشے کو اجاگر کیا ہے۔ اور ترقی پسند و جدید ترقی پسند افسانہ نگار کے روپ میں، ان کو آپ کے سامنے پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ میں نے اس قابل قدر شخصیت کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

"پریم چند کا ایک رومانی کردار" میرا یہ مقالہ۔ ایم۔ اے کے امتحان کی تیاریوں کے دوران میں ترتیب پایا تھا۔ پریم چند، اردو کے سب سے بڑے افسانہ نویس اور ناول نگار مانے گئے ہیں۔ جنہوں نے اردو افسانے کو "نیا رخ" (DIMENSION) دیا۔ ان کے یہاں زندگی کی حقیقی اور جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ کہانیاں مفروضہ عشق کے دائروں سے نکل کر، حقیقی بستیوں میں آتی ہیں۔ وہاں کی تہذیبی، سماجی اور معاشرتی زندگی، اس آئینہ میں، اپنے اصل روپ میں منعکس ہوتی ہے۔ کرشن چندر اور شکست" یہ مقالہ بھی، امتحان کی تیاریوں کے دوران میں، تحریر ہوا تھا۔ کرشن چندر، ایشیا کے مایہ ناز افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مگر ناول نگار کی حیثیت سے، خاص شہرت حاصل نہیں کر سکے کرشن جی کا ناول "شکست" ان کی ابتدائی کوشش ہے۔ اس ناول میں بھی، شہری اور دیہاتی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی اشتراکی نظریئے کی گہری چھاپ بھی ملتی ہے۔ اس مقالہ میں" شکست" کا تنقیدی محاسبہ کیا گیا ہے۔" ادب سماج کا رشتہ" اور" تیر کے بہتر نشتر" یہ دونوں مقالے، کالج کی زندگی کی یادگار ہیں ——— "دو گمنام صوفی شاعر" یہ مجموعہ کا ایک اہم مقالہ ہے۔ اس میں دو صوفی شاعر حضرت صادق علی شاہ چشتیؒ اور حضرت مسکین علی شاہ چشتیؒ کی ادبی شخصیت پر، جو گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کو ہٹایا گیا ہے۔ یہ دونوں صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ پہلی بار خاکسار نے ان کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ حضرت صادق شاہؒ کی نثری تصنیف "رسالہ برزخ" کا انکشاف بھی، پہلی بار راقم الحروف نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ اشرف علی شاہؒ مورکھ شاہؒ اور دیگر گمنام ادبی فنکاروں کا تعارف بھی، پیش کیا گیا ہے۔

" لفظ و پیکر" میرا نقش اول ہے، جس میں، میں نے اپنے خون جگر سے رنگ بھرا ہے۔ اگر یہ "نقش" آپ کو متاثر کر سکا، تو میں سمجھوں گا، میری محنت سوارت ہوئی۔ آپ کا تعاون ——— سرپرستی اور رہنمائی، مجھے حاصل رہی، تو یقیناً "نقش ثانی" ——— "نقش اول" سے بہتر طریقے سے پیش کر سکوں گا

پیش کر سکوں گا۔ اس سلسلے میں، ان بزرگوں کا ممنون —— ہوں، جن کے فیض روحانی نے مجھے، کھرے کھوٹے کی پہچان دی ——

• حضرت محمد ابراہیم شاہ چشتی ★ حضرت حاجی دلگیر شاہ وارثی

اور ان احباب کا بھی ممنون ہوں ——

• پروفیسر طیب انصاری • پروفیسر اے محمد ابراہیم • نصر قریشی • ل۔م۔ شاھد • پروفیسر مرزا اختر علی بیگ • ڈاکٹر رضی ناطقی • ناظم سلطان پوری • فیروز احمد قمر • ظ۔ کلیم • جان عالم سیف • ساجد آثر • ریاض عظیم آبادی • کمال جعفری • سعید قدرت • شہود عالم آفاقی • خواجہ حسن امام • جلیل چاند پوری • عزیز وہاب • رئیس آنولوی • وکیل احمد صدیقی

ان ارباب علم و فن کا بھی شکر گذار ہوں ——

• کلیم الدین احمد • آل احمد سرور • ڈاکٹر عطا کریم برق • ڈاکٹر محمد حسن علامہ جمیل مظہری • خواجہ احمد عباس • سہیل عظیم آبادی • پروفیسر اختر قادری • ڈاکٹر محمد حسنین • ڈاکٹر شارب ردولوی • پروفیسر اکبر الدین صدیقی • سالک لکھنوی • ایم۔اے۔ مجید • قیصر شمیم • نشاط الایمان • ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ • سہیل واسطی • ابراہیم ہوش • اعزاز افضل • کرامت علی کرامت • مظہر امام • حرمت الاکرام • شمس کنول • خلیق انجم • قمر اعظم ہاشمی۔

اساتذہ کرام کا بھی ——

• پروفیسر مسعود حسن • پروفیسر شاہ مقبول احمد • ڈاکٹر جاوید نہال • ڈاکٹر ظفر اوگانوی پروفیسر نیاز احمد خاں • پروفیسر فخر الدین صدیقی اثر • جناب عبد الوہاب • پروفیسر محمد امین • جناب جعفر ساہنی • پروفیسر مظہر حسن • جناب اختر حسین • پروفیسر عبد الرؤف

معاونین ——

• اختر راہی • محب الرحمٰن کوثر • قیام انیس • اسلم عندلیب • محبوب انور • حافظ مفاضل الحق مہری • مظفر حسین مانپوری • غضنفر علی خاں • اسلام قمری • عاشق فیض آبادی

والد محترم محمد قاسم صاحب، والدہ محترمہ مجیب النساء اور برادر محترم محمد عمر صاحب نے زندگی کی پر خار وادیوں میں، مجھے سہارا دیا۔ اور میری زندگی کو غم کی دھوپ کے بجائے، خوشی کی ٹھنڈک

دی۔ ان کے

دی۔ ان کے تبسم کے چراغ کی روشنی میں میرا ذہنی و ادبی سفر جاری رہا اور ہے۔ نانا محترم محمد شفیع صاحب کا بھی ——— اب میں ان دو شخصیتوں یعنی حضرت ظہور الحسن و بیگم کی خدمت میں، ہدیۂ تشکر پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔ جو میرے حقیقی دادا و دادی، نہ ہونے کے باوجود، مجھے ان سے زیادہ محبت دی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ حضرت ظہور الحسن جیسے دادا کے سایۂ عاطفت میں، میرے ذہن کی تربیت و نشو و نما ہوئی۔ اور محترمہ زبیدہ خاتون جیسی دادی کی ممتا بھری آغوش میں، پرورش ———

میری علمی و ادبی زندگی، مغربی بنگال کے ادبی ماحول کی دَین ہے۔ جس میں خلوص بھی ہے، محبت و اپنائیت بھی۔ اور عصبیت و نفرت بھی۔ ایک طرف تو میرے ذہن کو استاذی محترم ڈاکٹر جاوید نہال نے صیقل کیا۔ دوسری طرف میرے ہمعصر شاعر و ادیب نے میری ادبی کاوشوں کی مدحت کر کے، آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اور ساتھ میں اسے اپنی بدبختی و بدنصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ "بعض بزرگوں" نے پست حوصلہ کرنے کی کوشش کی۔ مجھ پر ایسے اعتراضات کیے، جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ بعض بزرگوں نے محتاط رویہ اختیار کرنے کے باوجود، دبے الفاظ میں ہمت شکنی ہی کی۔ اور بعض نئی پود کے ادیبوں نے میری ادبی کاوشوں، پر یک لخت قلم نسخ پھیرنے کی سعی بھی کی۔ ادبی ماحول کے ان "تضادات" کے باوجود، میرے دل میں، میرے اساتذہ اور ہمدردوں نے جو چراغ روشن کیا تھا۔ اسی کی روشنی میں اپنی منزل طے کرتا رہا ——— اور اسی روشنی میں یقین و عزم کی بدولت، اعتراضات اور مخالفتوں کے طوفان میں بھی اپنا سفر جاری رکھوں گا۔

ایم۔ اے۔ نصر

۲۶؍ جنوری ۱۹۸۶ء

۲۴ براہورن روڈ، کلکتہ ۱۰۰۰۰۰

امیر خسرو کی ہندوی شاعری

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں 'تحقیق' نے بہت سی تصویریں بنائی ہیں، اور بہت سی تصویریں بگاڑی ہیں۔ تلاش و جستجو سے گمشدہ تصویریں، ابھر کے سامنے آئی ہیں، تو کچھ تصویریں، دھندلا بھی گئی ہیں۔ اسی طرح تحقیق کی گمشدہ کڑیاں، ملتی گئیں۔ گویا دنیائے ادب میں 'تحقیق' نے 'نئی راہیں' بنائی ہیں۔ اور 'قدیم ورثہ' کو پرکھنے کا شعور عطا کیا ہے اور معیار بھی۔ محمد لیٰسین نے مختصر الفاظ میں 'تحقیق' کی یہ تشریح پیش کی ہے۔ "'تحقیق' دراصل ایک علمی ریاضت ہے، جس کے ذریعہ نہ صرف گمنام مصنفین کی تصانیف کو منظر عام پر لایا جاتا ہے بلکہ کلاسیکی اور جدید اساتذہ کے کلام کی خوبیاں بھی اُجاگر کی جا سکتی ہیں۔"[1] یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مملکت اردو میں تحقیق کا چراغ، بہت دیر سے روشن ہوا۔ عرصہ دراز تک، ہمارے شاعر و ادیب، گردش وقت میں، مبتلا رہے۔ اور ادب کے 'چوکھٹے' میں کمتر درجے کے ادیب و شاعر کی تصویر آویزاں رہی۔ لیکن میزان تحقیق نے انصاف کے تقاضے کو پورا کیا، اور حق بہ حقدار رسید کے مصداق، گمنام شاعر و ادیب کو 'پس منظر' سے 'پیش منظر' لانے کی لائق تحسین کوشش کی۔ اور ان کی عظمت کو اجاگر کرنے کی سعی میں کامیاب بھی رہے اور ناکام بھی۔ ناقدین ادب کو مواقع فراہم کئے کہ وہ تجزیاتی مطالعہ کے بعد ان کے مقام کا تعین کریں۔ اس طرح ادب میں، تحقیق کی اہمیت اور

---

[1] کچھ تحقیق کے بارے میں مطبوعہ ہماری زبان (دہلی) یکم فروری ۲۰۰۱ء

افادیت واضح ہوئی۔ اور مستقل فن کی حیثیت سے، اس نے اپنی جگہ بنالی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "تصویر" کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک روشن تو دوسرا تاریک۔ تحقیق میں بہت سی خوبیاں ہیں، تو خرابیاں بھی۔ اس میں یقین اور قطعیت سے، کوئی بھی بات نہیں، کہی جا سکتی۔ 'اثبات' کے ساتھ 'نفی' کی گنجائش بھی ہوتی ہے، اور اس گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بعض محققوں نے 'الجھنیں' بھی پیدا کر دی ہیں۔ اور 'نئے نظریے' کو 'بنیاد' بنا کر 'دوسرے نظریات' کو 'غلط' ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں، جن میں ایک 'علاقائی عصبیت' بھی ہے۔ کیونکہ ہمارے محققین، اپنے 'علاقہ' کی 'اہمیت' تسلیم کرانے پر مصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "آب حیات" سے لیکر "تاریخ زبان اردو" اور 'بنگال کا ادب' تک 'زبان اردو کی پیدائش وارتقا سے متعلق مختلف نظریے سامنے آئے، اور ساتھ ہی "تردیدی نظریے" بھی۔ اس طرح ہمارے محققین نے مسئلہ کو سلجھانے کے بجائے، مزید الجھا دیا۔ اور تحقیقی زاویوں سے زیادہ "ذہنی اپج" پر اعتماد کرتے ہوئے "نظریہ" قائم کرتے رہے۔ چنانچہ اردو کی لسانیاتی تصویر، اپنی اصل شکل میں، سامنے نہیں آسکی۔ اور بہت سے قابل قدر شاعر و ادیب، تشکیک کی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں، اور اس قافلہ میں، امیر خسرو بھی، شامل ہیں۔

امیر خسرو، اپنے دور کے 'نابغہ' تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور وہ سبھی خاص کشش رکھتے ہیں۔ فارسی شاعر کی حیثیت سے، انہوں نے جامی و سعدی اور آذری سے داد و تحسین وصول کی اسی طرح ہندوی اور اردو شاعر کی حیثیت سے بھی۔ وہ اردو کی لسانی تاریخ میں بھی اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ خسرو نے اردو میں اس وقت شاعری کی، جب یہ 'زبان' نہیں بلکہ 'بولی' تھی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اردو کو 'بولی' کی مملکت سے نکل کر، 'زبان' کی سرحد میں، داخل ہونے تک کے سفر میں، بہت سے نشیب و فراز اور مراحل سے گذرنا پڑا۔ وہ بہت دنوں تک ابتلا اور کشمکش کی زندگی گذارنے پر مجبور رہی ہے۔ گام گام پہ ناساعد حالات، زنجیر پا بنے۔ ایسے وقت بھی آئے۔ اور کبھی ایسے کرب میں مبتلا ہوئی کہ چند گھڑیوں کی مہمان بن گئی تھی۔ مگر اس کی سخت جان نے موت کو شکست دیدی اور 'بولی' کا سفر تمام ہوا۔ اس پر رنگ و روغن چڑھا۔ اور اس کی تہذیب ہوئی تو، زبان کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اس ارتقائی سفر میں، اس نے کتنے ہی رنگ روپ بدلے ہیں، مختلف ناموں سے یاد کی گئی ...

یاد کی گئی ہے۔

اردو کا جدید زبانوں میں شمار ہوتا ہے، اور اردو کے ارتقاتی سفر میں، جو بولیاں اس کا سہارا بنیں، وہ دلّی، متھرا اور پٹیالی و ہریانہ میں بولی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب اس خیال سے اکثریت کو اتفاق ہو گیا ہے کہ اردو کی بنیاد، کھڑی بولی اور ہریانوی ہے۔ جو دلّی و آگرہ اور متھرا وغیرہ میں، مروج تھی۔ کھڑی بولی، اصل میں بانگڑو کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ جو ہریانہ، دلّی اور پٹیالی میں بولی جاتی تھی۔ اور مغربی ہندی کی شاخ، کہی جاتی ہے۔ امیر خسرو کی ہندوی شاعری کا ان علاقوں کی بولیوں کے ساتھ، گہرا رشتہ ہے۔ اور اس گہرے رشتے کی تہیں الٹے بغیر، ہم امیر خسرو کی ہندوی شاعری سے متعلق، کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتے۔ حامد حسن قادری نے، اردو کے ارتقائی سفر پر، ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"امیر خسرو کی تصنیف سے اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تصانیف تک یعنی تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ پنجاب کے کسی بزرگ کے قول کو زبان پنجابی یا زبان ملتانی کہا گیا ہے۔ اہل گجرات کی زبان کو زبان گجراتی، اہل دکن کی زبان کو دکنی نیز بلا امتیاز ان زبانوں کو زبان ہندی بھی کہہ دیا گیا ہے۔ لیکن اہل دہلی و نواح دہلی کی زبان کو زبان ہندی کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا نے جس کی اصل ٹکسالی، دمتھرا تھی قدیم زمانے ہی سے مختلف صوبوں میں مختلف شکلیں پیدا کر لی تھیں، جو امتیاز کے لئے مقامی ناموں سے معروف تھیں۔ اردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے مل کر بنی ہے، پھر بھی اس کا اصل سانچا متھرا و دہلی کی زبان ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کی مخصوص زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں، لیکن موجودہ صوبجات کی زبان' وہی زبان ہندی ہے' جس نے اب اردو کی شکل اختیار کر لی ہے۔"[1]

اردو شعر و ادب کے ابتدائی معماروں میں، امیر خسرو، بلاشبہ اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں، گرچہ اس باب میں، سعد سلمان کا ذکر بھی آتا ہے، خسرو نے 'غرۃ الکمال' کے دیباچہ میں

---

[1] تاریخ زبان اردو، ص۵

سعد سلمان ...

سعد سلمان کے ہندی دیوان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ دیوان، ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ممکن ہے سعد سلمان کا دیوان، ان بولیوں میں ہو، جو وقتی طور پر اردو سے منسوب کر دی گئی تھیں۔ بہرحال اوّلیت کا تاج، امیر خسرو کے سر ہے۔ پروفیسر قیوم صادق نے اپنے مضمون "صوفیانہ شاعری" میں امیر خسرو کے متعلق، تحریر کیا ہے۔

"اردو کے ابتدائی دور میں، امیر خسرو، ایک درخشندہ تارے کی طرح چمکتے ہیں۔ ان کا لقب ہی، شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند" ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ استعمال کئے۔ اور اس کے علاوہ ابتدائی زبان میں، ایک دل کش روانی بھی پیدا کی۔"

اور اس باب میں، ڈاکٹر صفدر آہ کا یہ خیال ہے:-

"یہ بات حتمی طور پر اور قطعی ہے کہ وہی کھڑی[۲] بولی، جو لکھی نہیں جاتی تھی، صرف بولی جاتی تھی، نو ہندی مسلمانوں کو موافق آئی اور انہوں نے اس بولی کو اپنی زبان بنا لیا۔ خسرو اس عہد کے ہیں، جب یہ بولی، فارسی میں ڈوب کر موجودہ شکل اختیار کر چکی تھی۔"[۳]

امیر خسرو پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ماں ہندی نژاد تھیں ان کی ماں کی بولی 'بانگرو' تھی۔ وہ فارسی سے نابلد تھیں۔ جس کا اثر امیر خسرو پر بھی پڑا۔ کیونکہ ماں کی آغوش میں، بچے کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ اور وہ تعلیم اس کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے، نقوش ترتیب دیتی ہے۔ یوں بھی مادری زبان سے مراد 'ماں کی زبان' ہی ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، خسرو کی ماں کی بولی، بانگرو تھی۔ جو کچھ مہذب ہو کر کھڑی بولی کہلائی۔ امیر خسرو، ایک ذہین شاعر تھے اور ان کی ذہانت صرف فارسی زبان کے طلسمی حصار میں مقید نہیں رہی۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور اس وقت کے مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید بھی۔ اس امر سے سبھی واقف ہیں

---

[۱] مطبوعہ "برگِ آوارہ" ڈیگلی (حیدرآباد) [۲] کھڑی بولی سے مراد بانگرو ہے، کیونکہ امیر خسرو کے زمانے میں کھڑی بولی، اس کا نام نہیں پڑا تھا۔ [۳] امیر خسرو کی مادری زبان مطبوعہ آجکل (خسرو نمبر) ص۱۱

کہ صوفیائے کرام....

کہ صوفیائے کرام کا وتیرہ، رہا تھا کہ وہ 'مقامی بولی' کے ذریعہ تبلیغ کرتے تھے۔ لہٰذا اس خیال کے پیش نظر بھی، خسرو کا "مقامی بولیوں" سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ وہ نہ صرف اپنے دور کی مروجہ بولیوں سے متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے ہندوستان کو ایک ہندوستانی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ ہندوستان کی زمین، موسم، پرندے، پھول، ریت، رسم و رواج، اور دانشوروں کا گہرا اثر قبول کیا اور شعر بھی کہے۔ خسرو، فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی قادر تھے۔ لیکن وہ زبان ہندوی کے بارے میں، ایک خاص تاثر رکھتے ہیں۔ اپنی مادری زبان کے متعلق، وہ فرماتے ہیں ؎

ترکِ ہندوستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکرِ مصری ندارم کز عرب گویم سخن

حتیٰ کہ پدری زبان یعنی ترکی پر بھی ہندوی کو فوقیت دیتے ہیں ؎

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راج است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

خسرو کے جو ہندوی کلام دستیاب ہیں، ان کو دو خاص حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دوہے مکرانیاں پہیلی وغیرہ، عام موضوعات ہیں۔ جبکہ غزل اور قطعات میں ادبیت ہے۔ اور یہ خاص انداز کی چیزیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں، بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں، ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور یہ شعر ؎

شبانِ ہجراں، دراز چوں زلف و روزِ وصلش، چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس غزل کا مقطع ہے ؎

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

متذکرہ غزل کے چند اشعار کے مطالعہ سے، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امیر خسرو، فارسی کی طرح

"ہندوی زبان" پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس غزل میں فارسی اور ہندوی یعنی بھاکھا کا حسین امتزاج ہے۔ شمس اللہ قادری نے بھی "تاریخ اردوئے قدیم" میں امیر خسرو کی اردو شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے، ان کی ایک غزل پیش کی ہے۔ جس کے دو اشعار درج ذیل ہیں۔ جو خسرو کی اردو شاعری کے متعلق، رائے قائم کرنے میں۔ معاون ہو سکتے ہیں:

خوار شدم، زار شدم، ست گیار — در غمِ ہجر تو، کمر ٹوٹا ہے
روئے تو رونق شکنِ آفتاب — سرو بہ پیش قد تو لوٹا ہے

امیر خسرو کے 'دوہے' میں بھی، ادبی رنگ، پوری تابانی کے ساتھ جھلکتا رہا ہے:

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا، من پیو کا دو بھئے اک رنگ

خسرو کے کلام میں شائستگی، تہذیب بیان اور سہل ممتنع کے اچھے نقوش ملتے ہیں۔ اسلوب میں جدت اور نیا آہنگ، ہندوستانی معاشرت اور ہمہ طریقۂ فکر کا گہرا رنگ ہے۔ ابتدائی دور کے دوسرے شعراء کبیر، ملک محمد جائسی، رسن کھان، اور چندر بردوئی وغیرہم کے یہاں ہندوانہ تہذیب کا عکس ہے۔ جبکہ خسرو کے یہاں مسلم معاشرہ اور تہذیب کی بھی، جھلک نمایاں ہے خسرو اور کبیر میں، اس لحاظ سے مماثلت ہے کہ دونوں کے کلام میں تصرفات نموئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کبیر کی ہندی شاعری پر کوئی حرف نہیں آیا۔ جبکہ خسرو کی کتاب "خالق باری" کو بعض محققین و ناقدین، ان کی تخلیق ماننے سے منکر ہیں۔ جن میں محمود شیرانی، زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

مولوی صاحب سرن پناہ
گدا بھکاری خسرو شاہ

حافظ محمود شیرانی کا اعتراض ہے کہ اس شعر میں 'مولوی صاحب' کا استعمال، ہمیں مشکوک کر دیتا ہے۔ یہ خسرو ہی کا....

ہے کہ یہ خسرو ہی کا کلام ہے۔ کیونکہ خسرو کے عہد میں "صاحب" اس معنی میں مستعمل نہیں تھا۔ جس معنی میں اب استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ 'خالق باری' پوری کی پوری، امیر خسرو کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اس کا بڑا حصہ، عہد جہانگیر کے شاعر نام خسرو کی دین ہے۔

ہماری تحقیق بہت سی سیڑھیاں طے کر لینے کے باوجود، اس زینے پر پہونچ نہیں پائی ہے، جس پر کھڑے ہو کر، ایک محقق ناقد، قطعیت کے ساتھ کہہ سکے کہ "خالق باری" امیر خسرو کی تخلیق ہے۔ جہانگیر کے عہد کے نام خسرو کی نہیں۔ تشکیک کے دائرے اس لئے وسیع ہو گئے ہیں کہ 'خالق باری' میں بعض ایسے الفاظ حقہ، تمباکو، جیٹل صاحب یعنی لارڈ صاحب، وغیرہ "بانگڑو" اور "کھڑی بولی" میں رائج نہیں تھے۔ اور غیاث الدین بلبنؔ یا تغلق کے عہد میں بھی، ہندوستان میں ان چیزوں کا چلن نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس زمانے میں ترنگیزی الفاظ، بانگڑو یا دوسری بولیوں میں شامل ہوئے۔ تمباکو، وغیرہ خالص پرتگالی لفظ ہیں۔ مگر ہم بغیر کسی دلیل یا ٹھوس ثبوت کے یہ نہیں ——— کہہ سکتے کہ 'خالق باری' میں جتنی چیزیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی امیر خسرو کی نہیں۔ امیر خسرو نے 'غرۃ الکمال' میں لکھا ہے کہ ان کی ماں ہندی نژاد تھیں، پان بہت زیادہ کھاتی تھیں اور ماں کی بولی میں انہوں نے شاعری کی ہے۔ مگر اس بے دقیع اور بے وزن شاعری کو احباب میں ریوڑیوں کی طرح، بانٹ دیا تھا۔

خالق باری بھلے ہی، امیر خسرو کی مکمل تصنیف نہ ہو، مگر اس میں، ان کا کچھ حصہ ضرور ہے۔ بعد میں بہت ساری الحاقی چیزیں۔ اس میں داخل ہو گئیں۔ الغرض 'خالق باری'، امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر منوانے سے قاصر ہے۔ کیونکہ 'خالق باری' کی پہیلیاں، مکرنیاں وغیرہ اردو کی نہیں (کیونکہ اردو نام کی کوئی بولی یا زبان، اس وقت معرض وجود میں نہیں آئی تھی) بلکہ بانگڑو یا ہندوی کی کہی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی نظر میں "یہ خالق باری "ہندی کا پہلا لغت ہے، جو اپنے مترادف عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ، بصورت منظوم، ہمارے پاس آج بھی، موجود ہے۔" اور ڈاکٹر یٰسین صدیقی رقمطراز ہیں کہ "اینگلوسیکسن ادب میں آلڈہم کی اہمیت اس کی پہیلیوں RIDDLES کی وجہ سے بھی ہے، اس لحاظ سے، وہ ہمیں امیر خسرو کی یاد دلاتا ہے۔"[۱]

---

[۱] انگریزی ادب کی مختصر تاریخ ص ۱۲

امیر خسرو کی پہیلیاں، مکرانیاں اور دو سخنے وغیرہ کی مثالیں، ملاحظہ فرمایئے :-

پہیلی :-

فارسی بولی آئینہ   ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے   منہ دیکھو جو اسے بتائے   (آئینہ)

بیسوں کا سر کاٹ لیا   نا مارا نا خون کیا   (ناخن)

بن بوجھ پہیلی :-

سامنے آئے کر دے دو   مارا جائے نہ زخمی ہو   (آئینہ)

کہہ مکرنیاں :-

برسا برس وہ دیس میں آوے   منہ سے لگا رس پیا وے !!
واخاطر میں خرچے دام   اے سکھی ساجن، نا سکھی آم   (آم)

دو سخنے :-

گوشت کیوں نہ کھایا   ڈوم کیوں نہ گایا   گلا نہ تھا
جوتہ کیوں نہ پہنا   سنبوسہ کیوں نہ کھایا   تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا   وزیر کیوں نہ رکھا   دانا نہ تھا

امیر خسرو کی ہندوی شاعری کو صیقل کرنے میں "فن موسیقی" سے ان کی گہری دلچسپی اور ریاضت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تقی احمد خاں خورجوی کی یہ رائے قابل ذکر ہے کہ "امیر خسرو نے سب سے پہلے عجمی موسیقی کے انداز پر ترانہ، قول، نقش و نگار، گل وغیرہ گانے ایجاد کئے" صاحب نغمات الہند کی نظر میں "آپ کو موسیقی میں جو کمال تھا، اس کا اظہار ناممکن ہے۔ بس مختصراً اتنا کافی ہے کہ راگ راگنیاں بنانا کھیل سمجھتے تھے۔ شہ ناز، زیلف، سر پردہ، عشاق، فرودست، ایمنی، سازگری، حجاز، زنگولہ، صنم، ایمن بسنت، کوکب، کافی، اور غازہ، آپ ہی کے جدت طبع کے نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ طبلہ آپ ہی کی خاص ایجاد ہے۔ آپ کے ایجاد کئے ہوئے تانوں میں سول فوختہ، اور فرودست، اب بھی رائج ہیں۔ اور ستار کی ایجاد کا شرف بھی، آپ کو حاصل ہے" اور اب میں ڈاکٹر

سید ظہیر الدین مدنی کے یہ الفاظ، پیش کروں گا "خسرو نے موسیقی کے فنی پہلو کی مناسبت سے اس کے ادبی پہلو میں بھی، قابل قدر اضافہ کیا، جس کی وجہ سے غنائیہ شاعری میں وسعت پیدا ہو گئی .... ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا ہے، جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون، راگ اور تال کے اعتبار سے، متحد ہوتے تھے، ترکیب دیدیئے جاتے تھے مثال کے طور پر امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے، جس کا مطلع ہے ؎

زحال مسکیں، مکن تغافل، ورائے نیناں، بنائے بتیاں
جو تاب ہجراں، ندارم ایجاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں"[1]

امیر خسرو کی ادبی شخصیت کی، کئی مختلف رنگوں کی آمیزش سے، تکمیل ہوئی ہے، اور یہ تکمیلیت آسان نہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی یہ شخصیت متضاد ہو گئی۔ مگر تضاد، حسن تضاد سے خوبصورتی کی علامت بن گیا ہے۔ انہوں نے فارسی شاعری میں، اپنا سکہ چلایا تو، بانگرو یا کھڑی بولی کو ادبی حیثیت دینے کی بھی کوشش ضرور کی تھی۔ میر تقی میر جیسے بدماغ تذکرہ نویس کو بھی "نکات الشعرا" میں خسرو کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ "اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد"۔ اس باب میں ایک جدید نقاد اور شاعر عمیق حنفی کی یہ رائے، ہمیں امیر خسرو کی شاعری کی شناخت، جدید انداز سے کراتی ہے۔

"خسرو اپنی حقیقت پسندی کے باعث، ہمارے اور قریب آ جاتے ہیں۔ اپنی مثنویوں میں، وہ جس واقعات نگاری، منظر کشی اور خاکہ نگاری کی مثالیں، پیش کرتے ہیں، وہ اپنے عہد کے تجربے کے عینی اور معروضی شاہد بن جاتے ہیں۔ یہ وہی رویہ ہے، جسے ٹی۔ ایس ایلیٹ نے شاعری کیلئے، تجویز کیا کہ شاعر کی شخصیت، اس کے شعری اور تخلیقی تجربے میں ملوث نہ ہو بلکہ محض CATALY TIC AGENT کی حیثیت رکھے۔"[2]

---

[1] اردو غزل ولی تک، ص ۱۳، ص ۳

[2] امیر خسرو اور عصر جدید، مطبوعہ آجکل (اردو نمبر) ص ۳۱

امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت۔ مختلف علوم و فنون میں، ان کی دسترس کا غماز ہے۔ اور وہ موجد کی شکل میں بھی سامنے آتے ہیں۔ جو ان کی ذہانت کا بیّن ثبوت ہے۔ گویا اجتہاد اور ایجاد، انکی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ لامحدود تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر (ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) لکھتے ہیں۔ "وہ مذہب، فقہ، نجوم، ہیئت، اور صرف و نحو میں غیر معمولی درک رکھتے تھے۔ انہیں عربی زبان، علم و ادب سے اچھی خاصی واقفیت حاصل تھی۔ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے۔ مزید برآں ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔"[۱]

امیر خسرو کی ادبی شخصیت سے، ان کے کٹر سے کٹر مخالف کو بھی، انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں اور ان کی یہ حیثیت، مضبوط ستونوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ تحقیق جوں جوں، ارتقائی منزل طے کرتی جائیگی، امیر خسرو کی ہندوی شاعری کی تصویر اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آئیگی اگر یہ سراغ مل جائے گا کہ وہ واقعی اردو شاعری کے موجد ہیں، تو لالہ سری رام کی آتما خوش ہوگی کہ ان کی یہ رائے غلط نہیں ہوئی کہ "امیر خسرو، اگرچہ سب سے اوّل صاحب دیوان اردو کے نہیں۔ مگر اوّل اردو شعر کے موزوں کرنے والے ہیں۔ اور اردو شعر کے موجد ہونے کی حیثیت سے ہم انہیں خمخانۂ جاوید کا پیر مغاں تسلیم کرتے ہیں۔"

---

[۱] امیر خسرو کی حب الوطنی مطبوعہ آجکل (اردو) نمبر ا ص ۲۲، ص ۲۳

دو گمنام صوفی شاعر

مغربی بنگال میں اردو کے آغاز و ارتقار کی بہت سی تصویریں، ماضی کے دھندلکے میں گم ہیں۔ مگر جو تحقیقی کاوشیں ــــ سامنے آئی ہیں، وہ تسلی بخش کہی جا سکتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر ہمارے بزرگ ادیبوں اور محققوں نے بنگال کی جانب توجہ کی ہوتی، تو بہت سی ایسی تصویریں، اس وقت ہمارے سامنے ہوتیں، جو تحقیقی ادب کیلئے مفید و موثر اور اہم اضافہ ثابت ہوتیں۔ اسی تغافل کا نتیجہ ہے کہ بہت سے بلند پایہ شاعر و ادیب "گوشۂ گمنامی" ہی میں رہ گئے۔ ان بدنصیب "ادبی فنکاروں" میں صادق علی شاہؒ اور مسکین علی شاہؒ بھی ہیں۔ صادق شاہؒ خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام سید خیرالدین اور تخلص صادق تھا۔ صادق شاہ کی شخصیت پر، ابھی وقت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں، بہت کم معلومات دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے خلیفہ مسکین علی شاہ تھے۔ جو بنگال میں "چراغ بنگالہ" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور یہ سلسلہ معرفت ہنوز جاری ہے ــــ

صادق شاہ کہاں سے آئے تھے؟ وہ کب پیدا ہوئے؟ ان کی وفات، کب ہوئی؟ یہ سب باتیں صیغہ راز میں ہیں اور تحقیق طلب بھی ہیں۔ ان کے متعلق، محمد ابراہیم جہازی نے اسی سلسلے کے ایک بزرگ حضرت رمضان علی شاہؒ کے حوالے سے بتایا کہ "میرے مرشد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت صادق شاہؒ کا مزار اقدس، کولمبو میں ہے۔" جبکہ مسکین شاہؒ کے پوتے اور ان کے مزار کے مجاور سید فضل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ حضرت صادق علی شاہؒ کا مزار، آسام[1] میں ہے۔ اور انکا

---

[1] تاج محمد انصاری (نعمت پور۔ اورنگ آباد۔ گیا) مرید شاہ کلیم الدین چشتیؒ نے سید فضل الرحمٰن کے الفاظ کی تصدیق کی اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حضرت صادق علی شاہ کا مزار شریف، گوال پاڑہ (گھاٹ

بقیہ ص ۲۵ پر

مزار شریف ...

مزار شریف، دو خاص حصوں میں منقسم ہے۔ ایک طرف مسلمان، فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ اور دوسری جانب ہندو، اپنے دھرم کے مطابق، مزار کا درشن کرتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ صادق شاہؒ، کلکتہ آئے تھے اور انہوں نے یہاں اپنے طور پر اسلام کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں حصہ لیا۔ سید فضل الرحمن کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس وقت موجودہ نیو مارکیٹ (کلکتہ) کی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ وہاں ایک کھولا باڑی تھی۔ اور اسی باڑی میں، صادق شاہ ٹھہرے تھے۔ تحقیقی زاویہ نگاہ سے اگر حالات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے، تو ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سفارش حسین رضوی نے، جس صادق شاہ کا ذکر کیا ہے، وہ یہی صادق شاہ ہیں۔ رضوی نے لکھا ہے:-

> "قاسم کا کہنا ہے کہ اصل میں وہ پنجابی تھا۔ اور ترتیب تذکرہ کے وقت فرخ آباد میں، فقیرانہ زندگی گذار رہا تھا۔" [۱]

"دیوان صادق" میں مندرج یہ تحریر، اس باب میں مزید روشنی ڈالتی ہے:

> "یہ گنجینۂ معرفت و خزینۂ موعظت موجب انتباہ خلائق اعنی دیوان صادق تالیف لطیف و ترتیب منیف عمدۃ العارفین و زبدۃ السالکین طریقت گاہ، دستگاہ جناب سید خیر الدین صاحب معروف بہ صادق علی شاہ، متخلص بہ صادق ماہ رجب المرجب ۱۳۴۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۸ء کو مطبع مجیدی کانپور میں باہتمام محمد شفیع مالک مطبع بحلیۂ صحت آراستہ و پیرایۂ طبع سے پیراستہ ہوا۔" [۲]

حضرت صادق شاہؒ، سلسلہ چشتیہ کے معتبر بزرگ اور حضرت محب اللہ چشتی کے خلیفہ تھے۔ ذیل کے سطور میں شجرۂ خلافت چشتیہ ______ کا کچھ حصہ نقل کر رہا ہوں، تاکہ میرے الفاظ کی صداقت کو ثبوت مل جائے:-

خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ
↓
خواجہ فخر الدین محب النبی چشتی
↓

جوگی گوپا) آسام میں ہے۔ اور وہ وہاں جا چکے ہیں۔ گوال پاڑہ (آسام) میں مزار شریف کے قریب، عالیشان مسجد بھی ہے۔ عبد الغنی چھپروی مرید شاہ کلیم چشتیؒ نے بھی تاج محمد کے ان الفاظ کی تصدیق کی ہے۔

[۱] اردو مرثیہ ص ۲۵۱ [۲] خاتمۃ الطبع دیوان صادق مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۸ء

خواجہ محب اللہ چشتی رح
↓
خواجہ صادق علی شاہ چشتی رح

خواجہ صادق علی رح، حضرت محب اللہ چشتی کے خلیفہ تھے ؎

ہے بجائے حمد حمد بر شہ محب اللہ کا ⁂ نعت ہے لائق جسے نعت رسول اللہ کا

لیکن وہ مرید حضرت فخرالدین چشتی رح کے تھے۔ جیسا کہ اس شعر سے بھی ظاہر ہوتا ہے ؎

مولوی صاحب چراغ چشت فخرالدین نام ⁂ صادق استاد بر ہان فخر مولانا میرا

حضرت فخرالدین چشتی رح جلیل القدر بزرگ تھے۔ وہ خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی کے صاحبزادے اور سجادہ نشیں تھے۔ آپ کے متعلق، حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی نے فرمایا تھا۔ "یہ فرزند شہر شاہجہاں آباد کو اپنے نور ہدایت سے منور و روشن کرے گا۔" آپ کے یہ اقوال، بہت مشہور ہیں اور تصوف کی دنیا میں "چراغ راہ" کی حیثیت رکھتے ہیں:

حضور دو غیب کو دل سے دور کرنا چاہیے۔

یاد مولیٰ سب سے اولےٰ ہے

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

سالک کو چاہیے کہ ضبط اوقات کو ہاتھ سے نہ دے

سالک کو فریب نفسانی نہ کھانا چاہیے

انسانی مظہر جمیع مراقبات الٰہیہ و کونیہ ہے

محب النبی حضرت مولانا فخرالدین چشتی رح کے متعلق، ظہور الحسن شارب رقمطراز ہیں۔

" آپ نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو رات کے آخری حصہ میں اس جہان فانی سے رحمت یزدانی کی طرف رحلت فرمائی"[1]

اس طرح یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صادق شاہ رح کی ولادت ۱۱۹۹ھ سے قبل ہوئی تھی۔ جس کو تقریباً ۱۹۰ سال ہوئے۔ اگر اس وقت صادق شاہ رح کی عمر ۲۲ سال بھی تسلیم کی جائے، تو بھی انکی ولادت

---

[1] مناقب فخریہ بحوالہ دلی کے ۲۲ خواجہ ص ۲۰۵

کو ۱۶۲ سال کا عرصہ ہوا۔ اس طرح وہ مصحفی اور امام ناسخ کے دور کے شاعر، ثابت ہوتے ہیں۔ "ثمرۃ الفواد" میں سید مرتضیٰ نے، ایک بزرگ سید صادق علی کا ذکر کیا ہے، جو مصنف کے والد اور ابراہیم رضوی کے فرزند تھے۔ اور ان کے حوالے سے یہ سطور بھی، نقل کیے ہیں۔

> "حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آدمی کچھ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک کالا داغ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگر توبہ کر لیا تو محو ہو جاتا ہے۔ اگر اور گناہ کرے تو وہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ جب دل تمام کالا ہو جاوے تو پھر ہرگز توفیق توبہ کی نہیں ہوتی۔"

قیاس کہتا ہے کہ "دیوان صادق" کے مصنف بھی، یہی صادق شاہ ہیں۔

حضرت صادق علی شاہ، دنیائے چشت کے ان بزرگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے حق و باطل کو باطنی نظر سے دیکھا اور پرکھا ہے ——— "اشعار" کے "پردے" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دیوان صادق[1] ۱۹۲۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ ½ سائز اور ۸۰ صفحات پر مشتمل، اس دیوان میں، ردیف الف تا یے۔ غزلیں شامل ہیں۔ جن میں رموز عشق اور حقیقت تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صادق شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان سے "چند اشعار" نقل کر رہا ہوں ؎

کس سے ہو سکتا ثنائے خالق اکبر ادا ٭ اور پیمبر یا صحاب اربعہ رہبر ادا
شعلہ رو پر جان کھوتا ہے پروانہ جب ٭ لذت دیدار سے چشم ملتا ہے تب
جاتے ہو کہاں من کو لیے من کے موہن ہوت ٭ کر زخمی چلے دل کو میرے دل کے لگن ہوت
مجھ دل شیدائی کو زنجیر کرتے ہو عبث ٭ جان سے گذرا ہوں تم تدبیر کرتے ہو عبث
اشک کے لشکر چلے آتے ہیں یار و فوج فوج ٭ قاتل عشق تلے ٹمتے ہیں یار و فوج فوج
خود کیا اظہار وحدت محفل دریا کے بیچ ٭ ہیں حباب یہ جو پھرتے مشکل دریا کے بیچ
کیونکر کسی سے ہو سکے دالدار کی شرح ٭ خنداں لبان شیریں سخن یار کی شرح
کھینچ پردے کو بنا دے اے گل گلزار رخ ٭ چق اٹھا دیکھوں ذرا آ اے مرے عیار رخ

---

[1] دیوان صادق کا مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود ہے۔

این و آں سے دور ہوں پر ایک رکھتا ہوں سند ٭ لوحِ دل پر نقش ہے وہ نقش ہے اللہ احد

زاہدانِ خشک کو ایماں لذیذ ٭ عارفِ جانباز کو عرفاں لذیذ

عشق کہنا اور ہے اور عشق میں جانا ہے اور ٭ عشق میں تن میں گنواں خونِ جگر کھانا ہے اور

درد میں مجھ عشق میں آپ رہتا ہوں گداز ٭ آپ ہوں عاشق میں اپنا آپ یار و دلنواز

وہ بتِ رعنا اگر گھر میں جو آیا تو بس ٭ چہرۂ قبلہ نما گرچہ بتایا تو بس

بہتر ہے سخن وہ جو دلدار کی ہو خواہش ٭ دھر کان اسے سنایا جو یار کی ہو خواہش

عاشقِ جانباز کو مردانگی ہونا خصوص ٭ دمبدم اس شمع کی پروانگی ہونا خصوص

مستوں کے آگے بھلا کب ہے عبادات فرض ٭ زہد نہ تقویٰ وہاں نا ہے ریاضات فرض

کافر ہوں نا مسلم ہوں رکھتا ہوں میں زنار فقط ٭ شہ رگ جس کو کہتے ہیں ہاں وہ تو ہے اک تار فقط

جو کہ ہے میخوار اس کو خانۂ خمار حظ ٭ عالمِ رسوائی میں ہے کوچۂ بازار حظ

سماع کو جو پایا سو پایا سمع ٭ دگرنہ ضلالت دکھایا سماع

طور کو موسیٰ کے جاوے کون کس کو ہے دماغ ٭ ہر احد میں جلوہ گر ہے نور جوں روغن چراغ

آکھڑے ہیں گھیر کے شیشے کو رنداں صف بصف ٭ مست ہے میخوار ہے افتاں و خیزاں صف بصف

عشق تو کہتے ہیں سب پر سخت ہے مسئلہ دقیق ٭ شرط ہے اس کو سمجھنا ہے یہ دریائے عمیق

میں اب اپنا عاشق ہوا ہوں جی بیشک ٭ میں درشن تو اپنا کیا ہوں جی بیشک

یار و سہاگن ہے وہ کچھ بھی جسے ہووے لاگ ٭ یار بغل میں لے ہووے مبارک سہاگ

عاشقو ہوشیار ہو معشوق سے پاؤ گے جُل ٭ خنجرِ مژگاں علم کر آکھڑا ہے سر پہ تل

میں خراباتی ہوا پیتے ہی یار وہ ایک جام ٭ کچھ خبر مجھ کو نہیں ہے کیا حلال اور کیا حرام

باادا عشوہ طرف سے یار کے آتا ہوں میں ٭ جوں نگاہ مست چشمِ یار کے آتا ہوں میں

تو تو کرتا ہے نئی بات و عقل رے چل چھو ٭ تو ہے نقال نکر نقل اصل رے چل چھو

شمع رو دیکھتے ہی پل میں کیا دیوانہ ٭ کیوں نجا جلکے مرے اس کے اوپر پروانہ

واہ رے حق کے دلارے کیا تری کچھ شان ہے ٭ تو مریض فرقتِ رب کا یقین درمان ہے

رسالہ نمبر ۲ | اس رسالہ کے مصنف، حضرت صادق علی شاہ ہیں۔ جبکہ مؤلف کی حیثیت سے

صوفی شیخ ....

صوفی شیخ سبحان عرف بسم اللہ شاہ کا نام درج ہے، یہ حضرت اشرف علی شاہؒ کے مرید تھے۔ محمد محسن عارف تلمیذ علامہ رضا علی وحشت نے "رسالۂ برزخ" کی قطعہ تاریخ کہی تھی ؎

لکھو اس کی تاریخ عارف یہ تم ؎ خیابان وحدت دُرِ احمدی !!

مؤلف نے "رسالہ برزخ" کے بارے میں لکھا ہے۔

"یہ رسالہ بیان فوائد برزخ میں ہے اس رعایت کے ساتھ نام رکھا گیا۔ رسالۂ برزخیہ، برزخ، رابطہ، واسطہ، مرشد چاروں نام مرشد کے ہیں: اسم مرشد کا خبر دیتا ہے۔ چاروں حرف سے اپنی ربوبیت کی شہود کا۔ دال سے دلالت، شین سے شہود، ر سے ربوبیت، میم سے مظہر کا اشارہ ہے۔"

نصیر الدین ہاشمی نے "اردو مخطوطات" (جلد دوم) کے حصہ "تصوف و اخلاق" میں چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر.....

---

۱ رسالہ برزخ کے سرورق پر یہ تحریر مندرج ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

الحمد للہ کہ کتاب رسالہ برزخ حنات فیض از تصنیف لطیف عالم باکمال معدن لدنی محرم اسرار مخفی و جلی مولانا مرشدنا حضرت خواجہ سید خیر الدین متخلص بہ صادق رحمۃ اللہ علیہ شیخ المشائخ عارف کامل حضرت خواجہ محب اللہ چشتی ———

رسالہ برزخ

بعنون عنایت از اہتمام

حضرت صوفی شیخ عبد السبحان عرف بسم اللہ شاہ صاحب مجلس مرید و مشیر انجناب خواجہ محمد اشرف علی چشتی المسکینی متوطن قصبہ منیر شریف محلہ قاضی ٹولہ ضلع عظیم آباد عرف پٹنہ ساکن شمس الہدیٰ روڈ، مکان A - ۳ پوسٹ بالیگنج کلکتہ در مطبع ستارہ ہند پریس واقع کلکتہ طبع گردید

باراول ایک ہزار جلد قیمت ۲/

۲ بسم اللہ شاہ صوفی بزرگ اور اچھے شاعر تھے۔ ان کا ایک شعر مندرج ہے ؎

اک نگاہِ لطف کن بر اشرف از بہرِ خدا ؎ کمترین در امتانت یا محمد مصطفیٰ

کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کے مصنفین سے وہ ناواقف ہیں۔ مثلاً "سہ رسائل تصوف" رسالہ سلوک "رسالہ تصوف"۔ یہ تینوں کتابیں ۱۳۰۰ھ میں تصنیف ہوئی ہیں۔ اور ان میں متصوفانہ خیالات قلمبند ہوئے ہیں۔ اور "شاعرانہ لہجہ" میں بھی یکسانیت ہے۔ ان کتابوں کے "اشعار" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مصنف صادق علی شاہؒ ہی ہیں۔ کیونکہ یہ اشعار، ان ہی غزلوں اور نظموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو یہاں سینہ بہ سینہ صوفیائے کرام میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ اور صادق علی شاہؒ سے موسوم ہیں ـــــــ اس سلسلے کے موجودہ خلیفہ، خانقاہ میں، ان "اشعار" کو مریدوں اور معتقدین کے درمیان، دہراتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ خاص طور پر "رسالہ تصوف" کا ذکر کروں گا۔ جو یہاں "بولتا نامہ" کے نام سے مشہور ہے۔ بولتا نامہ یہ طویل نظم ہے، جس کے بعض اشعار، ہاشمی صاحب کے ـــــ مندرج اشعار سے قدرے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر سہ

بولنے کی راہ پر ہو استوار ؎ بول بسم اللہ دل سے بار بار

ٍ۳ عارف نے رسالۂ برزخ کی تاریخ لکھی ہے سہ

رسالہ یہ برزخ کا شائع ہوا ؎ کہ علم لدنی کی ہے مثنوی
بیاں اس میں احمدؐ کے ہے میم کا ؎ جو روشن ہے تفسیر الف لام کی
یہاں جلوۂ قرب کا ہے بیاں ؎ حقیقت لکھی سرّ امکان کی
لطیفے رقم سرّ وحدت کے ہیں ؎ نکات اس میں لکھے ہیں سب ابجدی
بیان نحن واقرب کے ہے راز کا ؎ فنا اور بقا کی حقیقت لکھی
یہ صادق علی شاہ کی ہے کتاب ؎ زمانے میں بیمثل تھے جو ولی
چھپائی ہے مقبول عالم کتاب ؎ مؤلف ہیں بسم اللہ شاہ اشرفی
تصوف کی ایسی مدلل کتاب ؎ نہیں گذری ابتک نظر سے مری
لکھو اس کی تاریخ عارف یہ تم ؎ خیابان وحدت در احمدی
سنہ ہجری ۱۳۴۹

ٍ۴ رسالہ برزخ ص۲

جبکہ یہ شعر، یہاں اس طرح مشہور ہے ؎

بولنے کی راہ پر ہو مستقیم ؛ بولتا ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت صادق شاہ کا تعلق، بنگال سے گہرا رہا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ، بنگال میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں، صرف کیا ہے۔ یہاں کے لوگ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہوئے ہیں تو آپ نے زبان و ادب کے خزانہ میں بھی، بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ صادق شاہ بحیثیت صوفی بزرگ ہی نہیں بلکہ ایک بلند مرتبت شاعر کی حیثیت سے بھی، ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور "دیوان صادق" ان کی خوبصورت "ادبی تصویر" کو تازگی دیتا رہے گا۔

مسکین شاہ چشتیؒ خواجہ مسکین علی شاہ چشتیؒ، حضرت صادق علی شاہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کے دست فیض نے، اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اور اب بھی اس سلسلے کے بزرگ، فقراء اور خلیفہ، بنگال بالخصوص کلکتے میں موجود ہیں۔ نقشہ شجرہ کا ایک حصہ درج ہے۔

خواجہ مسکین علی شاہ چشتیؒ
- خواجہ عبدالعزیز مورکو شاہ چشتیؒ
- نقی شاہ چشتیؒ
  - احمد بخش احمد چشتیؒ
- خواجہ اشرف علی شاہ صادقی، چشتیؒ
  - خواجہ نعیم الدین شاہ وحدت چشتیؒ
    - خواجہ کلیم الدین شاہ چشتیؒ
      - حضرت رمضان علی شاہ چشتیؒ
      - خواجہ ابراہیم شاہ چشتیؒ

خواجہ مسکین شاہ "چراغ بنگالہ" کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ ان کا مزار شریف، نونا پوکھر ٹرام ڈپو (کلکتہ) کے قریب ہے۔ اور ستارہ ہند پریس (کلکتہ) سے متصل گلی بھی، مزار شریف تک جاتی ہے۔ تاریخ وفات، ۱۰ر صفر المظفر ۱۳۸۲ھ مطابق ۹ر ستمبر ۱۹۶۲ء ہے۔ مولوی عبدالرؤف وحیدؔ نے تاریخ وفات لکھی ہے ؎

عارف حق شناس مسکین شاہ ؛ آن خلیل خدا ولی اللہ
گم شدہ در مجاہدات کمال ؛ ہو نور مشاہدات اللہ

نور شمع مکاشفات...

نور شمع مکاشفاتِ او	؂	بر ضیا تر ز نور مہر و ماہ
دلکشا یش مراقبات گزیں	؂	کاشفِ سر کن فکاں دلخواہ
ہادی و رہبر رہِ عرفان	؂	مرشد رہنمائے ہر گمراہ
پاس انفاس کمترین عملش	؂	دم عیسٰی بہ ہر دمش ہمراہ
سالک مسلک فنا فی اللہ	؂	نازل منزل بقا باللہ
مرشد او جناب صادق شاہ	؂	مرشدش فخر الدین خدا آگاہ
از جہاں رفت سوئے باغ جناں	؂	بر زباں لا الٰہ الا اللہ
اے وحید حزیں زار و نزار	؂	خست بشکست از غم جانکاہ
از لب جاں بخواں تو سال وصال	؂	عرش اعلیٰ مکان مسکین شاہ رح

۸ ۲ ۔۔۔ ۱۲ ہجری

۳

۱ ۸ ۔ ۱۲ ہجری

حضرت مسکین شاہ، صوفی شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار متصوفانہ خیالات کے حامل ہیں۔"دیوان مسکین"[1] ـــــ میں مندرج ان سطور سے، دیوان کے سنہ اشاعت کے متعلق، واقفیت بہم پہنچتی ہے:

"دیوان مسکین در شہر ذی الحجہ ۱۳۱۲ ہجری مطابق ماہ مئی ۱۸۹۵ء عیسوی

باختتام رسید از فضل خدائے بزرگ و برتر و جملہ حمد از برائے او تعالٰی ثابت

است صلوٰۃ و سلام بر حبیب کرشافع گنہگاران است و بر اولاد و اصحابش

سلام کثیر باد"

دیوان کے سرورق پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہ لکھا ہوا ہے۔ صفحات ۳۰۰ ہیں اور غزلیں ۲۴۲ شامل ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ گلکرسٹ نے "اردو لغت" میں، جس مسکین شاہ کا ذکر کیا ہے اور بطور حوالہ "مرثیہ" نقل کیا ہے۔ وہ مرثیہ، حضرت مسکین شاہ کا ہے۔ دیوان مسکین سے چند اشعار

---

[1] حضرت مسکین کا دیوان اوّل، خستہ حالت میں، سید فضل الرحمٰن عرف ہولا میاں کے پاس موجود ہے

پیش خدمت ...

پیش خدمت ہیں ؎

شکر لازم ہر زباں کو کیوں نہ ہو اللہ کا ∴ سر بسجدہ خامہ جب ہوتا ہے بسم اللہ کا
مسکین محبِ فخر سے صادق ہو پیر کا ∴ بندہ خدا میں ہے جو تو بندہ فقیر کا
بحرِ ہستی میں جو عالم ہے عیاں مثلِ حباب ∴ از عیاں تا بہ نہاں ہینگے یہ مانند سراب
وہ شہادت ہوئی یاں جس کو بے تقصیر نصیب ∴ حشر میں ہو گی اسے زیارتِ شبیرؑ نصیب
خواب میں صورت جو اپنی آ دکھا جاتے ہیں آپ ∴ خواب آنکھوں سے مری ایک بار لیجاتے ہیں آپ
خلق میں ہر کوئی اگر ہوئے افلاک پرست ∴ خاکساری نے کیا دل کو میری خاک پرست
غم سے فرقت کے دل عاشق نہیں ہوتا اچاٹ ∴ بلکہ بڑھتا عشق ہے دن مشکلوں کے کاٹ کاٹ
ہے بری عشق کی تکرار بحث ∴ ناصحا ہم سے نہ ہر بار بحث
آیا نظر چمن میں جو وہ نونہال آج ∴ ہر گل رو خوں کے چہرے پر آئی بحال آج
یاد آتا ہے وہ دلبر شبِ ہجراں کے بیچ ∴ دل کے آئینہ میں آیا نظر ایک آن کے بیچ
کون سی ہے ناصحا اس دل کو سمجھانیکی طرح ∴ شمع رویوں پر جو دل رہتا ہے پروانہ کیطرح
جب کبھی آیا نظر ہمکو ترا اے یار رخ ∴ پھر لیے ایکبار دل سے اپنے ہو بیزار رخ
قیس و فرہاد بھی بد نام ہوا میرے بعد ∴ عشق کا بس یہی انجام ہوا میرے بعد
ہو گیا اپنے جو تقدیر کا ابتر کاغذ ∴ دل کے پرزے پہ لکھا نامہ بنا کر کاغذ
زلف شب گوں ہیں جو اس مہ کے رخ گلزار پر ∴ خوف ہے کالے کے ڈسنا کا دل بیمار پر
جس وقت کھل گیا در دل کا میرے کواڑ ∴ آیا نظر جو تنکے کے اوجھل میں تھا پہاڑ
کر کے غافل جو رہا وعدۂ دیدار ہنوز ∴ انتظاری میں رہے ہم ترے اے یار ہنوز
عمر بھر ساتھ پھرے ہم بھی ہما کے بہوس ∴ شاہ کیا ہوں گے گدا بھی نہ ہوئے ایک نفس
دل سے تو نہیں ہوتا ہے دلدار فراموش ∴ کس طرح کریں دل سے اے یار فراموش
رکھے ہے دل جو کسی دل سے یاں نہاں اخلاص ∴ تو واں بھی دل پہ ہے ظاہر اے مہرباں اخلاص
گر نہیں دیتے ہیں یاروں کو مرے اشعار فیض ∴ برا نہیں دیتے ہیں جو ہیں رمز سے ہشیار فیض
خلق کہتی ہے کہ مشکل ہے بہت جاہ غلط ∴ یک نگہ میں نہ ہو حاصل تو ہے واللہ غلط

نکر درا ز ...

نکر دراز سخن میرے روبرو واعظ ⁂ خدا سے ڈر کے ذرا کر تو گفتگو واعظ
جلتی ہے رشک میں رخ دلدار سے شمع ⁂ فانوس میں چھپی ہے اس انکار سے شمع
دل میں روشن ہو رہا ہے داغ فرقت کا چراغ ⁂ شمع رویوں سے مرا دل ہو رہا ہے داغ داغ
زندگی بھر ہم نے چاہا تجھ کو اے دلدار حیف ⁂ پر نہیں تو نے نہ چاہا اے مرے عیار حیف
سنتے ہی مست ہوا دل مرا افسانۂ عشق ⁂ گرچہ ہے رنج و الم غم سے سیہ خانۂ عشق
ہم سے تم منہ چھپاؤ گے کب تک ⁂ منہ نہ ہمکو دکھاؤ گے کب تک
سنایا اس نے بوقت سحر جو مجکو بھاگ ⁂ تو سنگ دل بھی ہوئے اب سنکے اسکا وہ راگ
ادھر نقوش ازل ہے ادھر ہے کوس اجل ⁂ وہاں بھی سنتے تھے چلچل یہاں بھی ہے چلچل
چھوڑ کر ہستی کو اب ملک عدم جاتے ہیں ہم ⁂ جا کے مل جاویں گے اس سے جس کے کہلاتے ہیں ہم
بھول گئے دو عالم کو اے ساقی یک پیمانے میں ⁂ تھا وہ نشہ نا مرگ نہو کم اس لے کے پی جانے میں
بتوں کو دل نہ دو تم دیکھکر رنگ طلائی کو ⁂ برا مسکینؔ نہ سمجھو میں جو کہتا ہوں بھلائی کو
تاب و طاقت دل کو یک ہو وہ جور و خوابی کے ساتھ ⁂ عشق میں سیماب دل تڑپے ہے بیتابی کے ساتھ
کیا نظر آئے ہے ایک تصویر پشت آئینہ ⁂ صورت دلدار ہے تحریر پشت آئینہ
تو مسکینؔ باد و آتش ، آب و خاکِ پاک ہے ⁂ ہو مرکب اس مکاں میں جیسے بے غمناک ہے

حضرت مسکینؔ شاہ نے "اشعار" کے پردے میں تصوف کے رموز و نکات ، بیان کئے ہیں اسرار خداوندی سے پردہ اٹھایا ہے اور مجاز و حقیقت کی تصویر پیش کی ہے ــــــ مسکینؔ شاہ کلکتے کے تھے مگر حضرت یحیٰی منیریؒ کی طرح انہیں بھی یہ شکایت رہی کہ اہل کلکتہ ، ان کے نہیں ہوئے ۔ ورنہ وہ کبھی نہیں کہتے ؎

زاد بوم اپنا جو کلکتہ نہو تا مسکینؔ ⁂ چھوڑ کر جاتے چلے ان کی عملداری سے

ان کے مرید اور جانشیں حضرت عبدالعزیز مور کھ شاہؒ اور خواجہ اشرف علیؒ تھے ۔ یہ دونوں بزرگ بھی شاعر تھے ۔ خواجہ اشرف علیؒ کا دیوان "پرتو اشرفیہ" شائع ہو چکا ہے اور "گیان چونتیسی" (طویل نظم) بھی ــــ جسمیں تصوف کے رموز و نکات بیان ہوئے ہیں ــ "تلاوت الوجود" اور "وجود العاشقین" کی تشریح پیش کی گئی ہے ۔ یہ کتاب بنگلہ زبان میں بھی ترجمہ

ہو کر ، ....

ہو کر، مقبول ہو چکی ہے۔ فی الوقت یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں۔ محمد محسن عارف نے حضرت اشرف علیؒ کی تاریخ وفات کہی اور اس نوٹ کے ساتھ، شائع کیا ہے۔

"قطعہ تاریخ وصال محبوب الہٰی حضرت ابو محمد اشرف علی الچشتی مسکینی رحمۃ اللہ علیہ از فکر اہل طریقت، خدا آگاہ حضرت سید خواجہ محمد شاہ صاحب شہرت ابوالعلائی عظیم آبادی ؎

حضرت اشرف علی شاہ ولی ÷ وائے ناکامی کہ از دارِ جہاں

بود طب وقت آں فرخ سیر ÷ عازم گلگشت جنت شد مگر

گفت شہرت مصرع سال وصال ÷ بست و یک ماہ رجب کردہ سفر

۱۸   ۱۳ ھ

خواجہ اشرف علی منیر، عظیم آباد (بہار) کے رہنے والے تھے۔ اور کلکتے میں شمس الہدیٰ روڈ نزد پورٹ آفس مکان نمبر ۸۔ا میں رہتے تھے۔ اشرف شاہؒ نے بنگال میں چشتیہ سلسلے کو فروغ دینے میں تمام عمر صرف کی۔ مورکھ شاہ بھی مسکین شاہؒ (جو اپنے مرشد صادق شاہ کی رعایت سے خود کو صادقی بھی کہتے تھے) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مورکھ شاہ کا نام، عبدالعزیز تھا۔ لیکن وہ "مورکھ" اور "مست" کہلاتے تھے۔ ان کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ علوم ظاہر سے نابلد تھے، اور یہ احساس، ان کے ذہن پر مسلط تھا۔ جب ان کے مرشد کا وقت آخر آیا، تو انہوں نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ "مورکھ کو بلاؤ"۔ مورکھ شاہ کو جب یہ علم ہوا کہ مرشد نے بھی، ان کو "مورکھ" کہا ہے۔ تو وہ مدرسہ تالاب (دلبلیلی) کے احاطے میں جا کے چھپ گئے۔ ان کے مرشد، ان کے پاس آئے اور ان کے کان میں "دو بول کہے" یہ سنتے ہی، انکی باطنی آنکھ روشن ہو گئی اور انہوں نے برجستہ کہا "عجب مزہ ملا مجھے آنکھ سے آنکھ ملانے میں" ———— ان صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ یہ "دو بول" وہ ہیں جن کے سنتے ہی "انحد کے باجا" کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انحد کے باجا سے مراد "صوت سرمد" لیتے ہیں۔ اور یہ دو بول ہی، صوفیائے چشت میں "اسم اعظم" سے موسوم ہیں۔ مورکھ شاہ، مختصر عرصہ کے بعد، کلکتے سے کہیں چلے گئے۔ کہاں گئے؟ اس کا علم، کسی کو بھی نہیں ہے۔ "رسالہ برزخ" میں مورکھ شاہ کے بارے میں یہ چند الفاظ قلمبند ہوئے ہیں۔

در منقبت....

"در منقبت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ جناب مکھو صاحب عرف مورکھ مرحوم بسلسلہ حضرت مولانا و مرشدنا جناب خواجہ مسکین رحمۃ اللہ علیہ صادقی رحمۃ اللہ علیہ" اور مورکھ شاہ (سرمست) کا کلام بھی، اس رسالہ میں شامل ہے، جو مندرجہ ہے

فکر انساں ہے بیگمان میم ؛ ذاتِ حق ہے نہانِ میم
کیا مٹائیگا کوئی شانِ میم ؛ ذاتِ باری ہے پاسبانِ میم
اُس کو رافع ازل سے حق نے کیا ؛ سرنگوں دیکھو ہے شانِ میم
ہے جو مدّاح اس کی ذاتِ علیم ؛ سارا قرآن ہے داستانِ میم
اس کو خالق کہیں یا مخلوق ؛ احد احمد کے ہے میانِ میم
گر شریعت کا پاس ہے مورکھ ؛ غیر ممکن ہے یاں بیانِ میم

یار سے آنکھیں لڑانا کوئی ہم سے سیکھ جائے ؛ وہ رموزِ عاشقانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے
وصلِ جاناں کی بھلا کس کو نہیں ہے آرزو ؛ اصل میں واصل کا ہونا کوئی ہم سے سیکھ جائے
منزلِ جاناں ہے جس جا رک گئے جبریل بھی ؛ دم میں واں سے آنا جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ابنِ مریم بھی ہمارے حال سے ہے بے خبر ؛ دم بدم مردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کس لئے نالاں ہے بلبل گل میں کس کا داغ ہے ؛ گلبدن پر داغ کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
احمدؐ بے میم کی کس کو بشارت ہو ولا ! ؛ اس پہ اب ایمان لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ہو کہاں مورکھ سے یہ مسکیںؔ نے جب افسوں کیا ؛ وہ کلامِ جادوانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے

یکایک ذات وحدت میں ارادہ آیا کثرت کا ؛ ہوا پھر گنجِ مخفی سے ہویدا نور حضرت کا
چلا سکّہ جو پھر آفاق میں مہرِ نبوت کا ؛ یکایک غل ہوا کونین میں کلمہ شہادت کا
دیا صدیق کو درجہ محبت کا صداقت کا ؛ عمر فاروق کو حاکم کیا اپنی عدالت کا
کیا عثمان کو نورِ خدا کے نورِ عین تھے جو ؛ جمع قرآں کیا وہ حلم و گنجینہ سخاوت کا

علی مرتضیٰ ...

علی مرتضےٰ شیرِ خدا ہیں دستگیر اپنے ؂ کہ جن پر ختم ہے درجہ شفاعت کا امامت کا
اٹھائیں کیوں نہ دل وے سنگدل پتھر پرستی ہے ؂ برہمن کو پڑھائیں جب صنم کلمہ شہادت کا
گلستانِ مدینہ چھوڑ کر ممکن نہیں مورکھ ؂ تمنا ہو دل بلبل کو میرے باغ جنت کا

ابر رحمت برسر رحمت ہے ساون کی طرف ؂ جھوم کر کالی گھٹا آئی ہے گلشن کی طرف
نقش وحدت کھینچتا ہے دائرہ تن کی طرف ؂ گاہ مسکن کی طرف اور گاہ ہے مدفن کی طرف
وصل ذاتِ احدیت ہے خانۂ تن کی طرف ؂ گاہ مسکن کی طرف اور گاہ ہے مدفن کی طرف
دائما اشغال ذاتِ احدیت کی ہے یہی ؂ آج مسکن کی طرف فردا ہے مدفن کی طرف
جیتے جی گلگشت رضواں ہو گئی اس کو نصیب ؂ نو بطوں کی سیر سے نکلا جو گلشن کی طرف
کشف ہو جائے ابھی اسرارِ میم احمدیؐ ؂ پردہ برزخ الٹ جائے جو روزن کی طرف
خیر و شر سے کچھ غرض مجھکو نہیں سرمست ہے ؂ صلح کل اپنی نظر ہے دوست دشمن کی طرف

ایک اور صوفی بزرگ کا کلام بھی "رسالۂ برزخ" میں دستیاب ہے۔ ان کے متعلق یہ تحریر بھی موجود ہے "جناب احمد بخش صاحب احمد صاحب دیوان خلیفہ اول صاحب مجلس بلسلہ جناب مولانا و مرشدنا خواجہ محمد نقی رحمۃ اللہ مسکینیؔ رحمۃ اللہ صادقی رحمۃ اللہ"۔ ان کا شعر ہے ؎

ظہور کن فیکون کا عجب ہے راز احمد ؂ کہ ذات حق سے ملے ہیں یہی ستارے سات

حضرت نعیم الدین وحدتؔ بھی۔ اسی سلسلے کے بزرگ اور اچھے شاعر تھے۔

الغرض محمد محسن عارفؔ کے اس شعر سے۔ ان صوفیائے کرام کے نظریئے اور عقائد پر، کسی حد تک روشنی پڑتی ہے ؎

ہے ظاہر نفخت من الروحی عارفؔ ؂ حقیقت میں جان جہاں ہیں محمد

حضرت صادق علی شاہؒ اور مسکین علی شاہ صادقیؒ نے بنگال میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کو فروغ دیا بلکہ صوفیانہ شاعری کے چراغ کو بھی نئے انداز سے روشن کیا۔ جس کی روشنی اب بھی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ جو ہمیں ان بزرگان دین و ادب کی یاد دلائے گی اور انکی خدمات کا اعتراف کرنے پر مجبور کرے گی۔

پریم چند ...

پریم چند کا ایک رومانی کردار

پریم چند کے ناول "گئودان" میں دیہات اور شہری زندگی کا جو خاکہ ملتا ہے۔ گرچہ وہ مکمل نہیں۔ پھر بھی شہر، بالخصوص دیہات کے ماحول سے متعلق ایسی باتوں سے ہم آشنا ضرور ہوتے ہیں، جو ہمیں شہر اور دیہی ماحول کو سمجھنے اور ان کے درمیان خط فاصل کھینچنے میں مدد دیتی ہیں۔ پریم چند نے، شہر سے متعلق، جن کرداروں کو ابھارا ہے۔ ان میں مالتی اور پروفیسر مہتا، خاص کشش رکھتے ہیں۔ مالتی ایک الہڑ دوشیزہ ہے۔ لیکن وہ ہندوستانی دوشیزہ کی طرح "شمع خانہ" بن کر "سحر" تک جلنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ چراغ محفل کی حیثیت سے، پروانوں کو جلانے اور ان پر قہقہے لگانے کی متمنی ہے اور وہ اپنے اس عمل سے مطمئن بھی ہے۔

مالتی کے کردار کا تجزیہ کرتے وقت، اس کے ماحول کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ مسٹر کول کی لڑکی ہے، جو اپنی چرب زبانی کی وجہ سے، اونچے طبقے میں متعارف ہے اور متاثر بھی۔ جہاں مغربی تہذیب کی تقلید کی جاتی ہے ——— وہ انگلستان سے ڈاکٹری کی ڈگری لیتی ہے۔ وہاں کے ماحول میں اس کی زندگی کا طویل عرصہ گذرتا ہے۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے جو پرانے نقوش مٹا کر، نئے نقوش ابھارتا ہے۔ لہٰذا مالتی کے وہ خیالات جو اس کے ماحول کی دین تھے۔ ان کو پختگی ملتی ہے، تو وہ اور بھی نکھر کے سامنے آتے ہیں۔

وہ جب انگلستان سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس

آتی ہے، تو ....

آتی ہے، تو اس کے کردار پر مغربی تہذیب کا رنگ گہرا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ مردوں سے آزادانہ روابط رکھتی ہے۔ ان کی محفل میں شریک ہوتی ہے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی ہے شراب و کباب کی محفلوں میں بھی ______ تعلقداروں سے، اس کے تعلقات ہیں۔ بقول پریم چند "نئے جگ کی مجسم صورت ہے۔" گویا اس کی زندگی، تیز و تند طوفان کی طرح ہے، جس کا رخ نہ جانے کب؟ کس طرف؟ کدھر کو ہو جائے۔ یا تیز رو دھارے کی طرح، جس کے متعلق، یہ رائے دینا مشکل ہو کہ وہ کس وقت، کس سمت مڑ جائے۔

مالتی ایک ڈاکٹر ہے۔ مگر اس کی معالجانہ ہمدردی صرف سرمایہ داروں تک محدود ہے۔ علی عباس حسینی کی نظر میں "وہ ڈاکٹر ہے۔ انسانی اعضا کی ساخت اور ان کے اغراض سے واقف ہے۔ اس لئے بیباک ہے، نڈر ہے، خوش طبع ہے اور مردوں سے ملنے جلنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے عام طور پر پاک چلن نہیں تصور کرتے۔"[1] شاید اس لئے کہ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ وہ ایک ہندوستانی دوشیزہ ہے۔ اور ایک ہندوستانی دوشیزہ کے لیے یہ خصوصیت عیب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کی ہلچل زندگی میں پروفیسر مہتا، ایک روشن کرن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو کالج سے آٹھ سو روپئے، تنخواہ ملتی ہے۔ جس کا زیادہ حصہ، وہ غریب طلبا، مفلس انسانوں اور غریب تنظیموں کو دیدیتے ہیں۔ وہ رائے صاحب اور مسٹر کھنہ سے دوستی رکھتے ہیں۔ ان کی دوستی، محض نادٗ نوش کے لئے نہیں ہے بلکہ مقصد مزدوروں کو ان کے سرمایہ دارانہ استحصال سے بچانا بھی ہے وہ غیر شادی شدہ ہیں۔ لہٰذا اس مالتی سے ان کی دلچسپی فطری امر ہے۔ لیکن وہ عورت کے معاملے میں، ایک خاص معیار رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی میں، گوبندی (مسز کھنہ) کی شباہت چاہتے ہیں، جو ہندوستانی عورت کی ایک مکمل اور سچی تصویر ہے، اور جس کی مالتی میں کمی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ہونیوالی بیوی کو اس جنگلی لڑکی کی طرح فطری سادگی کا مجسمہ دیکھنا چاہتے ہیں، جس میں ہندوستانیت کی شعاعیں منعکس ہیں۔ (یہ وہی جنگلی لڑکی ہے، جس سے مالتی اور مہتا کی ملاقات

---

[1] ناول کی تاریخ اور تنقید ص ۳۶۳

جنگل میں ...

جنگل میں، شکار کے دوران میں ہوئی تھی) ان کی نظر میں عورت، مرد سے برتر ہے۔ اس کا پاکیزہ اور ماں ہونا ہی، اس کی عظمت پر دال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ مالتی، مساویانہ حقوق کی طالب ہے، اور اپنے اسی مقصد کے حصول کے لئے، وہ "تنظیم تحریک نسواں" سے وابستہ ہے۔

پروفیسر مہتا سے ملنے کے بعد، اس کے دل میں محبت کی روشن شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ وہ مہتا سے قریب ہونے لگتی ہے۔ مگر مہتا کی رائے، اس کے متعلق وہی ہے، جو کھنہ اور گوبندی کی ہے۔ لیکن جلد ہی ان کے درمیان سے، پھیلی ہوئی بدگمانی کی خلیج گھٹنے لگتی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ عورت اور مرد کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے میں، کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں نظریاتی ٹکراؤ، اب بھی باقی ہے۔ فلسفہ کے غبار میں ڈوبا ہوا مہتا، یہ نہیں بھول سکتا کہ عورت شمع خانہ، ہے مردوں سے برابری کا حق مانگنا، اس کی بیوقوفی ہے۔ عورت اور مرد ——— گاڑی کے دو پہیے، جنہیں اپنی اپنی جگہ پر رہنا چاہیئے۔ جبکہ مالتی تحریک نسواں کی ایک متحرک رکن ہے۔ اور وہ برتری کی جنگ میں حصہ لے رہی ہے۔

مالتی کے اندر کی چھپی ہوئی عورت، کھل کر اس وقت سامنے آتی ہے۔ جب پٹھان کے بھیس میں پروفیسر مہتا، مالتی کو اٹھا لیجانا چاہتے ہیں۔ اس وقت مالتی کا بدلا ہوا، ایک نیا روپ سامنے آتا ہے۔ اس کے دلی تاثرات ابھر کے سامنے آتے ہیں، جو اس کی محبت کی پیاس کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ جذبہ اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جب وہ شکار کے لیے جاتے ہیں، اور وہاں جنگلی لڑکی سے مہتا، ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ تو مالتی ناراض ہو جاتی ہے۔ یہ ناراضگی اس لئے ہے کہ وہ مہتا کے خیالات سے واقف نہیں۔ ان کے ذہن میں پوشیدہ فلسفے کی گہرائیوں سے آگاہ نہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ مہتا، محبت کو فلسفی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں محبت، شیرنی ہے، خونخوار شیرنی ——— مہتا کی محبت کی تصویر کے اس رخ سے مالتی واقف ہوتی ہے، تو اس کا ذہن چونک پڑتا ہے۔ اور وہ شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس وقت مہتا کو اپنے فلسفیانہ نظریئے میں، کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس اس وقت جاگتا ہے۔ جب مالتی، محبوب سے دیوی بن گئی ہوتی ہے۔

مالتی کا کردار، نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہے۔ پریم چند کی بورژوا ذہنیت اور ان کے مارکسی نظریئے نے مل کر اس کی شخصیت کے پیکر کو تراشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مہتا کی طرف، اس لئے جھکتی ہے کہ ———

وہاں ...

وہاں ہوس کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ وہ ان کے قریب آجاتی ہے۔ اور مہتا کا فلسفہ (جو خود پریم چند کے خیالات ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند نے ناول میں، مہتا کا لباس اوڑھ رکھا ہے) اس کے ذہن کو سنوارتا ہے۔ اور ایک بدلی ہوئی مالتی، ہمارے سامنے آتی ہے۔

وہ دیہات میں جاتی ہے، تو دیہاتیوں کے ساتھ مل بیٹھتی ہے۔ ان سے ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح انسانی خدمت کا جذبہ، اس کے دل میں جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ اور اس کے اندر کی چھپی ہوئی عورت، اپنے مکمل شبیہہ کے ساتھ ابھرنے لگتی ہے، جو اپنی آنکھوں میں خوابوں کا طوفان سمیٹے ہوئے ہے۔ جس کی حسین تعبیر عورت و مرد کا اتصال ــــــــ شوہر کی قربت، بچے کا پیار اور نئے گھر کی تعمیر ہے۔

مالتی کی ممتا، اس وقت جاگ اٹھتی ہے۔ جب وہ منگل کی تیمارداری کرتی ہے۔ اس کے لئے، اپنا ایک کمرہ خالی کر دیتی ہے۔ رات دن ایک کرکے، اس کو صحت مند بنانے کی جستجو کرتی ہے۔ اس کی ممتا بھری محبت سے، گوبر اور اس کی بیوی، دونوں مطمئن ہیں۔ ایک غریب بچے کو مالتی کا ممتا بھرا پیار دینا اس تبدیلی کی جانب کھلا اشارہ ہے۔ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ وہ کھنہ سے دور رہتی ہے۔ اور مہتا کی طرف زیادہ جھک جاتی ہے۔ تاکہ مسز کھنہ (گوبندی) کو مسٹر کھنہ مل جائیں۔ گوبندی کا گھر، مالتی کی جوانی اس کے حسن کے شعلوں کی نذر نہ ہونے پائے۔ لیکن کیا مالتی اور مہتا، ایک دوسرے سے قریب آجاتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ محبت کی منزل پر پہنچ کر واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اس ٹریجڈی کی ذمہ داری، مہتا کے فلسفہ کے تصوراتی خاکے اور مالتی کی حساس طبیعت، دونوں پر یکساں ہے۔

مالتی ایک دور اندیش اور ہوشیار عورت ہے۔ اس کی واضح تصویر، اس وقت ابھر کے سامنے آتی ہے۔ جب تنخہ، مالتی کو مہارانی کے مقابل میں لانا چاہتا ہے۔ لیکن مالتی، الیکشن میں حصہ لینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اور وہ کھلے لفظوں میں اعتراف کرتی ہے کہ وہ ایک بار جیل گئی تھی، محض شوق سے ــــــــ آزادی کی جنگ میں، اس نے کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ اس کی تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھر کی ایک ذمہ دار فرد ہے۔ باپ کی آواز بند ہونے (فالج زدہ ہونے) کے بعد، گھر کی تمام ذمہ داری، اس کے سر پر ہے۔ اور وہ اپنی ذمہ داری، نہایت خوش اسلوبی سے نبھاتی ہے۔

بدلی ہوئی مالتی کی تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ وہ غریبوں کو مفت دوا دیتی ہے۔ اس طرح اس کے اندر کی، اس عورت کا وجود مکمل ہو جاتا ہے، جو مالتی کی آئیڈیل عورت ہے۔ جس کے متعلق اس کا کہنا ہے۔ "جو مکمل عورت ہو سکتی ہے، وہی مکمل بیوی بن سکتی ہے۔" مگر مہتا سے ندی کے کنارے کی گفتگو نے مالتی کی شخصیت کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ اس کی نظر میں مہتا کی اہمیت، گھٹ گئی، اس کے خیالات کو دھچکا پہنچا، اور وہ کراہ اٹھی۔ "امتحانی نگاہ، محبت کی نگاہ نہیں" یہ سوچ کر اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس طرح وہ دان اور تیاگ کی دیوی کے پیکر کو (اپنے وجود میں) تراشنے میں کامیاب ہو گئی۔ مگر مہتا کی وہ مالتی، اس سے بہت دور چلی گئی، جو اس کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں بننے کی آرزو مند تھی۔

مالتی کے کردار کو تراشنے میں پریم چند نے انسانی نفسیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج بھی ہمارے درمیان، بہت سی مالتیاں موجود ہیں جو ازدواجی زندگی کی خواہش کرتی ہیں مگر وہ یہ گوارہ نہیں کر سکتیں کہ اس کے لئے انہیں اپنے معیار سے گرنا پڑے۔ ——————

پروفیسر مہتا (ذاتی طور پر) شخصی حیثیت کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کئی جگہ اشتراکی نظریے کی بچھائی ہوئی پٹری سے ہٹ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک اشتراکی کی حیثیت سے کئی جگہ کنفیوزن، پیدا کرتے ہیں۔ دراصل پریم چند، اس کردار کی تخلیق میں، اس فنکارانہ خلاقی کا نقش نہیں چھوڑ سکے ہیں، جس کی جھلک ہوری اور دھنیا کے کردار میں ملتی ہے۔ وہ ہوری اور دھنیا کے درمیانی روابط کی طرح مہتا اور مالتی کے باہمی تعلقات کو ٹھیک سے واضح نہیں کر سکے۔ وہ مہتا کو عظیم دکھاتے ہیں، جس سے مالتی روشنی لیتی ہے۔ مگر آخر میں مہتا، مالتی کے اثر میں آجاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہتا کے کردار کی تخلیق کرتے وقت، پریم چند کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا۔ یا دیگر الفاظ میں مہتا کے کردار کی تخلیق کرتے وقت، ان کی فن کارانہ صلاحیت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ پریم چند جیسے فنکار سے ایسی لغزش کی توقع نہیں تھی۔ الغرض مالتی و مہتا کی زندگی کی مثال ہندوستانی معاشرے میں ملتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں، مہتا اور مالتی کے رومانی جوڑے نے نفس کشی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ دوسرے کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔

پریم چند کی شخصیت کی تشکیل ایسے روایت پسند ماحول میں ہوئی ہے، جو زندگی کی حقیقتوں

کو خواہ ...

کو خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، ظاہر کرنے سے صرف ہچکچاتی ہی نہیں، بلکہ معاشرے کی روایتوں سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ فرسودہ روایتی زنجیروں کو توڑنے کی ہلکی سی بھی تڑپ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رومانی کردار، اپنے جذبات کا ہر جگہ اپنے ہاتھوں گلا گھونٹتے نظر آتے ہیں اور عشق و محبت کی حدت میں موم کی طرح رات دن پگھلتے رہنے کے باوجود، بھائی بہن کے مقدس رشتے میں جکڑے نظر آتے ہیں۔ پریم چند کی یہی بزدلی، اس کے ناول 'بیوہ' میں بھی ابھر کے سامنے آتی ہے۔ جس کی بیوہ ہیروئن 'پُرنا' دوسری شادی کرنے کے بجائے۔ کسی آشرم میں پناہ لیکر، اپنے امڈتے ہوئے جذبات کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

کرشن چندر اور شکست

کرشن چندر ایک مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ممکن ہے وہ ناول نگار کی حیثیت سے بدلتے ہوئے زمانے کا اس حد تک ساتھ نہ دے سکے ہوں، جس کی ان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کرشن چندر کے ناول "شکست" کا مطالعہ کرتے وقت، اس خیال کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ یہ ناول کرشن چندر نے اس زمانہ میں لکھا تھا۔ جبکہ ترقی پسندی کی لہر، اردو ادب میں نئی نئی آئی تھی۔ اس چمکدار دیوی کے گرد، غمگین افسانہ نگاروں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ کچھ تو واقعی اس لئے ترقی پسند تحریک میں حصہ لے رہے تھے کہ وہ سماج کی اصلاح چاہتے تھے۔ اور بلاشبہ آج کے نئے ادب کی طرح اس زمانہ میں بھی، بہت سے لوگوں نے ترقی پسندی کو بطور فیشن کے اپنایا تھا۔ اس بحث سے قطع نظر، ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ جس وقت "شکست" لکھا گیا تھا، اس وقت کرشن چندر، پنجاب یونیورسٹی میں طالب علم تھے، ایک طالب علم کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، وہ جذبات کے ریلے میں بہت جلد بہ جاتا ہے، اس طرح یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کرشن چندر کا یہ ناول، ان کے ابتدائی ادبی نقوش میں ہے۔ حالات، ناول نگار کی عمر اور علمی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس ناول کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اور اس ناول کو جانچنے کے لئے نئے پیمانے تراشنے کے بجائے ہمیں اسی دور کی کسوٹی پر اس ناول کو پرکھنا ہوگا۔ آیا یہ ناول اس دور

کے لحاظ .....

کے لحاظ سے جبکہ یہ لکھا گیا، ایک کلاسیکی ناول کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ آج کے کرشن چندر اور ماضی کے کرشن چندر کے درمیان میں تقریباً ۴۲ برسوں کی ایک خلیج حائل ہے۔ ایک طویل فاصلہ ہے۔

بلاشبہ کرشن چندر نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی، اپنی ایک خاص حیثیت بنائی ہے، آنے والا وقت ممکن ہے، ان کو یہ وقعت نہ دے، جو انہیں اب حاصل ہے، یا اس سے بھی بڑھکر اور اونچا مقام دے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ وہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کرشن چندر ناول نگار کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ خواہ ان کے ناول ادب کے کسی بھی خانہ میں رکھے جائیں، ان کے مخالف نقادوں کو ان کا قد کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ نظر آئے۔ اس زاویہ نگاہ سے ہمیں کرشن چندر کے ناول شکست کا مطالعہ کرنا ہے، اور دیانتداری کا بھی، یہی تقاضہ ہے۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" ایک کلاسیکی ناول ہے۔ گرچہ اس میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ اپنی بیش بہا خوبیوں اور موضوع کے اعتبار سے، ایک اعلیٰ پائے کا کلاسیکی ناول ہے۔ دیہاتی زندگی کے دامن میں بکھری ہوئی سچائیوں کا عکس، اس ناول میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ تلخی کے ان پودوں کو اُگتے اور پروان چڑھتے ہوئے، دیکھ سکتے ہیں۔ جس نے انسان کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ تلخ تجربات و محسوسات کا بھرپور عکس ناول میں پوشیدہ ہے۔ یہ ہندوستانی عورت کی مظلومیت کا صحیح عکس بھی پیش کرتا ہے۔ کرشن چندر کا سحر طراز قلم، ان کی انقلابی رومانیت کو اپنے رنگین اسلوب میں یوں چھپا لیتا ہے۔ جس طرح سیپ میں موتی اور عزیز احمد کی نظر میں:

> "اس انقلابی رومانیت کی تہ میں ایک طرح کی انفرادیت، ایک رومانی شکستگی اور تشنگی بھی ہے۔ جو کرشن چندر کے نقطہ نظر پر حاوی ہے ناول میں (وہ) افسانے سے بھی زیادہ کامیاب ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔" [۱]

یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے ہم پہلوتہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صداقت سے بھی

---

[۱] "ترقی پسند ادب" از عزیز احمد ص ۱۱۲

انکار ممکن نہیں. جس کی طرف عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اشارہ کیا ہے ۔
"رومانیت اور انسانیت پرستی نے (کرشن چندر کی) طرزِ تحریر کو لطیف اور جاذب بنا دیا ہے اس میں سختی یا کرختگی کم ہے اور اگر اس کی ضرورت ہو تو طنز یہ خدمت انجام دیتا ہے۔" [۱]

تخلیق، مصنف کی شخصیت کا اظہار ہے، اس نقطۂ نظر سے ناول "شکست" کا مطالعہ کریں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوگی۔ کیونکہ کرشن چندر نے اپنے ناول میں اپنے مقصد کی وضاحت کی ہے۔ مگر وہ جذبات کے دھارے میں کبھی کہیں کہیں بہہ گئے ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنے نظریات کی لہروں میں اس حد تک ڈوب گئے ہوں کہ پھر ابھرے نہیں۔ کچھ اور سوچنے کا موقع نہ ملا ہو یا جوان خون کی تیز لہروں نے انہیں بھٹکا دیا ہو۔ مگر پھر بھی ڈاکٹر احسن فاروقی کے یہ خیالات تعصب کے لبادے میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں "شکست وقتی دلچسپی کی چیز ہے، اس سے زیادہ اس کی قیمت بعض اجزاء کی ہو سکتی ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے 'شکست' ایک صحافتی چیز ہی ٹھہرتی ہے۔" [۲] ہاں اس خیال سے کسی حد تک متفق ہوا جا سکتا ہے کہ "ان کی چیزوں کا زور اور اثر قوت قصہ گوئی کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت بیانی کی وجہ سے ہے۔" لیکن کشن پرشاد کول کے یہ الفاظ مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں:

"........انگریزی لٹریچر کا مطالعہ اچھا ہے۔ اور ان (کرشن چندر) میں تنقید نگاری کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ اگر وہ مختصر افسانہ یا ناول لکھنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں تو کسی زمانے میں اچھے تنقید نگار ہو سکتے ہیں۔ اور فسانہ نگاری کا شوق ایسا ہی دامن گیر ہے کہ نہیں چھوٹ سکتا تو مؤدبانہ عرض کرونگا کہ وہ لاہور کی اس فیشن ایبل سوسائٹی کا مرقع پیش کریں۔ جس میں رچ بس گئے ہیں، للّٰہ کشمیر کی دیہاتی زندگی کا پیچھا چھوڑ دیں۔" [۳]

اس طویل اقتباس کے درج کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کشن پرشاد کول جیسا ناقد بھی، اس حد تک انتہا پسندی کا مظاہرہ کر سکتا ہے، جبکہ وہ دوسری طرف کرشن چندر کو پریم چند کا

---

[۱] "ترقی پسند ادب" از عزیز احمد ص ۱۱۵ [۲] ناول کی تاریخ و تنقید [۳] نیا ادب ص ۸۶-۲۸۵

جانشین....

جانشین مانتا ہے۔ اس کی یہ تنقید (جو دراصل تنقیص ہے) محض اس لئے ہے کہ کرشن چندر نے کشمیر کے ماحول کی عکاسی، اس انداز سے نہیں کی، جتنا کہ حق تھا۔ ناول نویس اور سیّاح میں فرق ہے۔ ایک سیاح سے مقامات اور وہاں سے متعلق باتوں مثلاً رسم و رواج، لباس، رہن سہن کے سلسلے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے، اس کی غلطیوں کی گرفت کی جا سکتی ہے۔ مگر ایک ناول نگار، قابل معافی ہے، وہ اپنے موضوع کے لئے، کسی ایک مقام کا تعین کرتا ہے، تاکہ اپنی مرضی کے مطابق، ناول کا آغاز کر سکے۔

کرشن چندر نے شکست میں دیہات سے متعلق، ایک اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ جس میں سماجی، مہاجنی اور مذہبی استحصال کی جھلکیاں ملتی ہیں، تو امارت اور غربت بھی ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ طبقہ بندی، نسل پرستی اور چھوت چھات کی بیماری کا عکس نمایاں ہے۔ ہندو مسلم منافرت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ الغرض دیہات کے ماحول میں پھیلی ہوئی زہریلی تصویروں کا عکس عیاں ہے، تو دیہات کے قدرتی ماحول میں رومان کی چاشنی بھی، گرچہ یہ رومان، کامیاب نہیں ہوتا مگر ان کی محبت اختر شیرانی اور سلمیٰ کی نہیں بلکہ ن۔م۔ راشد اور میراں جی کی محبت ہے۔ جس میں جنسیت کی طوفانی لہریں ابھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

شکست میں دو کہانیاں بیک وقت چلتی ہیں، ایک شیام اور ونتی کی ہے، دوسری موہن سنگھ اور چندرا کی۔ اس ناول کا ہیرو شیام ہے۔ اور ہیروئن ونتی۔ حالانکہ ہیرو اور ہیروئن کے صحیح حقدار موہن سنگھ اور چندرا ہیں۔ شیام ایک اشتراکی نوجوان ہے۔ اس کی رجعت پسند علی جو سے بحث، کافی دلچسپ ہے۔ لیتری کا سین اچھا ہے۔ رام کنڈ اور سیتا کنڈ کے سین بھی خوبصورت ہیں، منظر نگاری، بہت اچھی ہے، کردار نگاری بھی مجموعی اعتبار سے بہتر ہے۔ مگر ناول کا اختتام اثر انگیز نہیں۔ حالانکہ پریم چند سے لیکر گورکی اور شیکسپیئر تک نے اس پر زور دیا ہے۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈر کا طرز گفتگو تفریحی ہے۔

ناول کا آغاز، ایک پس ماندہ علاقہ "ماندہ" سے ہوتا ہے۔ جہاں اشتراکی نظریے کی لہر نہیں پہنچی ہے۔ صرف شیام، اشتراکی نظریئے سے واقف ہے۔ اور اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ مگر اپنے مخصوص انداز میں۔ وہ ایک اشتراکی نوجوان ہونے کے باوجود، خوابوں کی دنیا میں کھویا رہنے والا نوجوان بھی...

نوجوان بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت کی رنگینیوں میں جب وہ کھوتا ہے، تو اپنے خیالات کا اظہار اپنے آپ سے کرتا ہے۔ لیتری کے مقابلے میں، جب وہ گھاس کاٹنے لگتا ہے، تو درانتی، ایک حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور وہ درانتی کی تقریر میں کھو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے ہاتھ کی انگلی کا کٹنا اور خون کا بہنا، ایک اچھا پنچ ہے۔

شیام، گرٹیا کی مصنوعی محبت کے دلدل سے نکل کر ونتی کی محبت کی دلکش وادی میں قدم رکھتا ہے، تو کھو سا جاتا ہے، مگر درگا داس، اس کی محبت کو اچک لیتا ہے، مگر ماں کی خاموش محبت، اس کے گرد زنجیروں کو پھیلا دیتی ہے اور وہ خاموش رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس موہن سنگھ اور چندرا کی رومانی جوڑی ہے۔ ان کی محبت میں سچی عقیدت ہے۔ برہمن اور چمار کی محبت سے بنی ہوئی چندرا، راجپوت موہن سنگھ کی محبت پالیتی ہے۔ جب کہ چھایا اور راجد حسین کے جسمانی اتصال کا نتیجہ ونتی، شکست کھاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے ماموں کی بھانجی ہے، جو اسے دو ہزار روپے کے عوض درگاہ داس جیسے مکروہ صورت سے بیاہ دیتا ہے، تعجب تو یہ ہے کہ کورٹ میں اپنے بھائی کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والی بہن، چہار دیواری میں مقید ہو کر اپنی بیٹی کو درگا داس کی درندگی کا شکار ہونے سے نہ بچا سکی۔

کہانی میں سطحی پن کی جھلک بھی ملتی ہے اور مرکزیت کا فقدان بھی۔ ناول میں ایسی تصویریں بھی ابھرتی ہیں، جن میں فنکار سے زیادہ نظریہ پرست مصور کی جھلک ملتی ہے — بیجا تفصیل کی وجہ سے بھی ناول میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ اور ناول نگار کی گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے۔ وہ کسی ابھے ذہن کے مصوّر کی طرح، تصویر میں رنگ بھرتا ہوا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی وادی میں پنجابی گیت کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اور ونتی شہری لباس میں ملبوس نظر آتی ہے۔ سروپ کشن کی اچکن، ماندہ کی تہذیب سے میل نہیں کھاتی۔ اور پریم چند کی دھنیا (گئودان) کی طرح کرشن چندر کے کردار بھی، کشمیری ماحول میں اردو بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اگر چاہتے تو "تازہ کشمیر" (لاہور اور امرتسر کے میل جول سے بنی ہوئی کھچڑی زبان) سے کام لے سکتے تھے۔ یا اپنے کرداروں کو کشمیری لہجہ دے سکتے تھے۔

کرشن چندر یہاں بھی چوک گئے۔ سروپ کشن، مکھیا اور برہمنوں کا سردار ہے۔ چھایا اور اس کی بیٹی ..

اور اس کی بیٹی (ونتی) سماج کی راندہ درگاہ ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی ایک اچھوت لڑکی سے کرے۔ بدصورتی کی مثال دی جا سکتی ہے۔ مگر کٹر مذہب پرست کا پہلا اصول مذہب ہوتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور ـــــ چندرا اور موہن سنگھ کی محبت میں گرم جوشی اور سچائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موہن سنگھ بحالت بیماری، یہ سنتا ہے کہ سروپ کشن کا بھائی، اس کی محبوبہ کی عزت لوٹنا چاہتا ہے، تو وہ اس کا خون کر دیتا ہے۔ مگر شیام، ایک سرد عاشق ہے۔ اس کی محبوبہ شادی کر لیتی ہے۔ کچھ روز سہاگ کے بھی گذارتی ہے۔ مگر عاشق کی شادی کی خبر سن کر وہ مر جاتی ہے۔ یہ موت غیر فطری ہے۔ کیا موت جلاپے کی وجہ سے ہوئی؟ یا محبت کی وجہ سے؟ یہ سوال ذہن میں خود بخود ابھرتا ہے۔ اگر محبت کی ناکامی کی وجہ سے ہوئی، تو وہ پہلے ہی کیوں نہ مر گئی؟۔

دراصل ان چار کرداروں میں چندرا، سب سے زیادہ پرجوش اور متحرک ہے۔ وہ ایک باغی کردار ہے، جو پولس کے چنگل سے اپنے بیمار عاشق کو چھڑانا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ فرار ہونے کا پلان ترتیب دیتی ہے۔ مگر شیام ایک مرد ہونے کے باوجود، اس کی جارت نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مینوفیسٹو پڑھ کر کمیونسٹ بنا ہے۔ لیکن عملی طور پر اشتراکی حدود سے بہت دور ہے۔ جبکہ موہن سنگھ اور چندرا، اشتراکی نظریہ سے واقف ہونے کے باوجود عملی طور پر ترقی پسند ہیں۔ حالات نے انہیں ترقی پسند بنا دیا ہے گویا کرشن چندر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حالات ہی سچے ترقی پسندوں کو جنم دیتے ہیں۔

چندرا کو ہسپتال میں رہنے کی اجازت دینے کی وجہ سے مسلمان ڈاکٹر پر کمیشن بٹھانا اور سروپ کشن کا یہ الزام لگانا کہ مسلمان ڈاکٹر ان کے مذہب میں مداخلت کر رہا ہے، ہندو اور مسلمان کے درمیان منافرت کی طرف کھلا اشارہ ہے۔

کرشن چندر نے سروپ کشن کی بیوی درگا کو روز روشن میں گوجر سے ملتے ہوئے ور جسمانی اتصال کا مرتکب ہوتے ہوئے دکھا کر دیہات کے ایک اہم رخ (جنسی بے اعتدالی) کو جاگر کیا ہے۔ مگر وہ درگا کے "فراخ کولہے" کا ذکر بار بار کر کے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ کیا صرف امیر عورتوں کے کولہے ہی "فراخ" ہوتے ہیں؟ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ

سروپ کشن....

سروپ کشن کو اپنے بیٹے درگا داس کے لئے ونتی کو حاصل کرتے ہوئے نہ دکھا کر، یہ دکھاتے کہ درگا داس، ونتی کو روپے کے زور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے ماموں کے ذریعہ جنسی اختلاط میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو محبت والوں کے درمیان، خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ ونتی خودکشی کر لیتی ہے یا شیام کی بانہیں اس کو اپنا لیتی ہیں، ایک اشتراکی نوجوان کی بانہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ناول میں حقیقت کا رنگ اور نکھر جاتا۔

ناول میں اور بھی کئی چھوٹے کردار آئے ہیں، جو فعال نہیں ہیں۔ لیکن ناول کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں ایک سیداں بھی ہے۔ جو گاؤں کی کہانی سناتی ہے اور عوض میں روپے بھی لیتی ہے۔ اس کے ذریعہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ الغرض شکست کا سرسری مطالعہ، کسی ہندوستانی فلم کی طرف ذہن کو لیجاتا ہے۔ مگر اس کے مقاصد پر غور کرتے ہیں تو اصلاحی لہریں، خامیوں کو دامن میں چھپائے ہوئے تیز رو نظر آتی ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ناول بعض خامیوں کے باوجود اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے اردو کے بہترین کلاسیکی ناولوں کے خانے میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

جاوید نہال کی افسانہ نگاری

مغربی بنگال میں اردو ادب کی ہر صنف پر خواہ اس کا تعلق "نثر" سے ہو یا "شاعری" سے، ہر دور میں بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ یہاں اگر غزل کے گیسو سنوارنے کی سعی کی گئی ہے، تو افسانے کی زلف کی مشاطگی بھی کی گئی ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے "فن" کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور آج بھی اس کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔

آزادی کے بعد ماضی کی بہ نسبت "نثر" کو مرکزیت حاصل ہوئی اور اردو ادب میں تنقید و تحقیق اور افسانہ میں جو وسعت و ترقی ہوئی، اس میں بنگال کے ادیبوں کا بھی، ایک خاص رول رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیرونی نقادوں نے عصبیت کی بنا پر، ہمیشہ یہاں کے ادباء و شعراء کو نظر انداز کیا ہے۔ اور انہیں "گوشۂ گمنامی" سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ "تعصب" ہے تو دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی وزن دار اور قدآور شخصیتوں کے سامنے، انہیں اپنے ادب و شاعر کا چراغ بجھتا ہوا نظر آنے لگا۔ اور مدافعت کے طور پر انہوں نے عمداً مشرقی ہند کے ممتاز و نمایاں فنکاروں سے تجاہل عارفانہ برت کر ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔

اردو میں مختصر افسانہ کی عمر کوئی زیادہ نہیں۔ دراصل اردو افسانہ کا آغاز پریم چند کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ اور ترقی پسند افسانہ نگاروں

میں پریم چند

میں پریم چند، ایک اہم نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ ترقی پسند ہونے کے علاوہ، رجعت پسند ماحول کے پروردہ بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بورژوا ذہنیت، انہیں ٹھٹک جانے اور کبھی کبھی فیصلہ بدلنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ ایک طرف وہ "کفن" جیسے شاہکار کے خالق ہیں۔ جو ترقی پسند نقطۂ نظر سے ایک مکمل اور جامع کہانی ہے۔ تو دوسری طرف ان کے افسانوں اور ناولوں میں "رجعت پسند نظریات" حاوی ہیں۔ مثلاً وہ "بیوہ" کی ہیروئین کو محض اس لئے آشرم بھیج دیتے ہیں کہ ان کا معاشرہ، دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ تضاد، ان کے یہاں "نمایاں" ہے۔

ترقی پسند تحریک نے "انگارہ" کی اشاعت کے بعد، افسانوی دنیا پر اثر جمانا شروع کیا۔ اس اثر سے بنگال کی ادبی دنیا بھی بچ نہیں سکی۔ یہاں کے ادبا و شعرا نے بھی، ترقی پسند خیالات و رجحانات کو سمجھا، پرکھا اور اپنایا۔ یہاں کے افسانہ نگاروں کی اکثریت نے ترقی پسند نظریئے کے تحت، افسانوں کی تخلیق کی۔ اور ان میں سے اکثر کہانیاں "نعرہ بازی" کے دائرے سے الگ تھیں۔ جاوید نہال کی کہانیاں بھی، اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ لہٰذا اس طرح سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی کشمیری لال ذاکر اور انور عظیم کی صف میں، ایک اور اہم نام کا اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر جاوید نہال کی متنوع شخصیت، کئی خانوں میں منقسم ہے۔ وہ بیک وقت ناقد، محقق، صحافی، افسانہ نگار، مترجم سبھی ہیں۔ اور ہر ایک میں، کامیاب ہیں۔ اگر ان کے ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ "پھول رانی" افسانوی دنیا میں، ان کے بلند مرتبہ کا متقاضی ہے، تو ان کی تحقیقی کتاب "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" ان کی محققانہ عظمت کی جانب نشاندہی کرتی ہے۔ اسی طرح ناقدانہ اور صحافتی حیثیت بھی، ایک عمیق مطالعہ چاہتی ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے ۱۹۴۰ء میں اردو افسانہ کی دنیا میں قدم رکھا۔ اور مسلسل ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۵ء کہانیاں لکھتے رہے۔ یہ کہانیاں، ہند و پاک کے مشہور اور معیاری جریدوں میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے کچھ افسانے "پھول رانی" کی شکل میں، منظر عام پر آئے۔ یہ مجموعہ "پھول رانی" ترقی پسند افسانوی مجموعوں میں، یقیناً خاص اہمیت رکھتا ہے۔ پھول رانی میں سماجی، معاشرتی، مشاہداتی اور کرداری کہانیاں شامل ہیں۔ جن کا مطالعہ ذہن پر

خاص تاثر...

خاص تاثر ابھارتا ہے۔ اور دائمی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہر افسانہ ایک مکمل تصویر ہے۔ جس میں سماج و معاشرہ کی تلخی ہے، تو مشاہدہ کی چاشنی بھی جانے پہچانے کردار، افسانوی لبادہ اوڑھے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ہم ان کے تصوراتی پیکر کو دیکھ کر چونک پڑتے ہیں۔ اس دلکش و پرمعنی مجموعہ کی پہلی کہانی " دلدل " ہے۔ اس سماجی کہانی میں، نام نہاد سماجی ٹھیکیدروں اور سفید پوشوں کی قلعی اتاری گئی ہے۔ اور نہایت تلخ انداز میں نگہبانوں کی مکروہ تصویر کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ دوسری کہانی " ماضی کی ایک رات " رومانی المیہ کہانی ہے۔ جس میں محبت اور ہوس کی لہریں ابھرتی رہتی ہیں۔ " عبدل ماما " میں ایک غریب سادہ لوح دیہاتی انسان کی رشتے کی عکاسی، خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ " رمضانی " بھی " عبدل ماما " کی طرح، ایک کرداری کہانی ہے۔ اس میں رمضانی کا کردار، ایک ایسے غریب شخص کی تصویر کو ذہن میں ابھارتا ہے۔ جس کی پسند و خواہش اور آرزو و تمنّا کی کسی کو پرواہ نہیں۔ اور وہ ——— یاس و ناامیدی کے گھیرے میں، موت کے خونخوار پنجوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی معنوی کہانی " پھول رانی " ہے۔ اس معاشرتی کہانی میں، محبّت کے تقدس اور ہوس کا تجزیاتی جائزہ ملتا ہے، جس میں گہرے طنز کی چاشنی بھی ہے۔ " چینی کی گڑیا " میں ایک ایسے بچّے کے پیکر کو تراشا گیا ہے۔ جس سے گھر اور سماج سے متعلق افراد، نالاں ہیں۔ اور " چند لمحے " محبت، دشمنی اور نفرت کی درمیانی دیوار کو ڈھانے کا درس دیتی ہے۔ " تلاطم " سکون " میں امارت و غربت کا تضاد ملتا ہے۔ " بالکنی " نفسیاتی کہانی ہے۔ جس میں ان ڈھلتی ہوئی عورتوں کی جنسی آسودگی کی حقیقی تصویر کا عکس نمایاں ہے، جو جنسی ہوس کی تکمیل کے لئے، سب کچھ کر گذرتی ہیں۔ آخری کہانی " جنگلی، وحشی، گنوار " ہے۔ یہ خالص رومانی افسانہ ہے۔ جس میں بورژوا طبقے پر گہری ضرب لگائی گئی ہے۔ اور امیر عورتوں کی تفریحی محبّت پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔

" پھول رانی " کی کہانیوں کا مطالعہ، ہمارے ذہن میں ایک ایسے افسانہ نگار کی تصویر کو ابھارتا ہے۔ جس کی کہانیوں میں امارت و غریبی کے تضاد کی تصویر، کھینچی گئی ہے۔ وہ خالص

معاشرتی...

معاشرتی افسانہ نگار ہے۔ اور اپنے خیال کی تلخی کو ہلکا کرنے کے لئے، وہ رومان کی چاشنی مہیا کرتا ہے۔ گویا وہ شکر ملی کونین کی گولی ہے، جو خوشنما کیپسول میں بند کر دی گئی ہے۔ یہ ایسا فن ہے جو ذہین اور خلاق افسانہ نگاروں کے یہاں ہی ملتا ہے۔

جاوید نہال نے ۱۹۵۶ء کے بعد، خاموشی اختیار کر لی، یہ خاموشی اس وقت ٹوٹی، جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ہند۔ چین کے جنگ کے پس منظر پر مبنی ایک افسانہ "تاج محل" انہوں نے لکھا، جو بیسویں صدی (دہلی) میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ، ایک غاصب حملہ آور کےخلاف ایک پُر معنی احتجاج کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند کہانیوں میں بے حد کامیاب اور اور مقبول کہانی "میری دنیا کی سیر کرو" ہے۔ جس میں جدید دنیا کی سامراجی اور جنگ جو قوتوں انسان کی وحشی جبلت اور کھنڈروں پر عظمت کا قصر تعمیر کرنے کی انجانی تڑپ کے خلاف اثر انگیز احتجاج ہے۔ اور دنیا میں اقتدار کے لئے ہونے والی لڑائیوں سے عوام میں نفرت کا شدید جذبہ ابھارنے کی کامیاب کوشش ہے۔ دنیا کی کئی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

تقریباً دس سال کی طویل خاموشی کے بعد (۱۹۷۰ء کے اواخر یا ۱۹۷۱ء کے اوائل میں) جاوید صاحب نے، افسانہ نگاری کی طرف پھر اپنی توجہ مبذول کی۔ اور اس بار بحیثیت افسانہ نگار' ان کی جو شبیہہ ابھری، وہ ایک جدید افسانہ نگار کی تھی۔ موصوف کا پہلا جدید ترقی پسند افسانہ "نیم کارس" جب ماہنامہ 'کتاب' (لکھنؤ) میں، شائع ہوا تو بہت سی حسرت بھری نگاہیں، بنگال کی جانب اٹھیں۔ جن میں خوشی تھی، مسرت کے چراغ روشن تھے۔ تو حسد کی آگ میں جھلسنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی ——— "نیم کارس" کا اسلوب جدید ہے، مگر خیالات ترقی پسندانہ ہی ہیں۔ اس میں سماجی ماحول کے ایک مخصوص گوشے کو کریدنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس افسانہ میں، "اینگلو انڈین طبقہ" سے متعلق، کچھ ایسے لوگوں کا "خاکہ" ذہن میں ابھرتا ہے، جو اپنی بیوی کو عصمت فروشی کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اور ان کی کمائی پر زندگی گذارتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب، اس کو گھناؤنے فعل سے تعبیر کرتی ہے۔ مگر یہ لوگ، جو ہندوستانی سماج کے اب جزو بن گئے ہیں، وہ ابھی بھی اپنے آباد اجداد کی مغربی تہذیب کے زیر اثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں شوہر ——— ہوٹل میں، محض اس لئے وقت گذارتا ہے، کیونکہ اس کی بیوی کو "خالی کمرے

کی ضرورت ہے ...

کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اپنے جسم کی شمع کو روشن کر سکے۔ شاید اس لئے کہ اس کے بغیر، وہ اپنی کھوئی آن بان اور روایتی شان و شوکت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔

اسی طرح "پانچواں کلنڈر" (مطبوعہ آہنگ، گیا) میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ نئی قدروں سے گریز نہیں کرنا چاہئے، وقت کا ساتھ دینے والے ہی، کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور "اداس بدن" (مطبوعہ 'عصری ادب' دہلی)، ایران کے جشن تاجپوشی کے موقع پر کی گئی فضول خرچی اور وہاں کے غریب عوام کے احتجاج کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ "نیلے پیلے" (مطبوعہ "مورچہ" گیا) میں، موصوف نے ایک ایسی عورت کی تصویر پیش کی ہے، جو پہلے بچّہ کی ماں بننے کے بعد ہی بیوگی کا لباس، پہن لیتی ہے۔ اور دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے رشتہ داروں کے پاس، مدد کے لئے جاتی ہے۔ تو ان کی آنکھوں میں جنسی ہوسناکی کی پرچھائیاں دیکھ کر کانپ جاتی ہے اور آخر ایک روز، شوہر کے ایک قریبی رشتہ دار کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے اس طرح وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ لیکن اس موقع پر وہ اپنے معصوم بچّہ کو فراموش نہیں کرتی بلکہ خودکشی کرنے سے پہلے، وہ اپنے بچّہ کو شوہر کے ایک دوست کے یہاں پہنچا دینا، اپنا فرض سمجھتی ہے ——— شوہر کے دوست کو اپنی زندگی کی روداد سناتی ہے، اور شوہر کے دوست کا سہارا پاتے ہی، وہ موت سے زندگی کی طرف، لوٹ آتی ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ بچّہ کی محبت، ماں کے ——— پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔

اس کہانی میں موجودہ گرتے ہوئے معاشرے اور اخلاقی گراوٹ کی تصویر کے ساتھ زندگی سے فرار کو مضمون قرار دیا گیا ہے۔ ناساعد حالات کا مقابلہ کرکے جینے کا درس بھی۔ دراصل یہ کہانی دورِ جدید کی تہذیب پر ایک گہری چوٹ ہے۔ نئی تہذیب کے کھوکھلے پن پر کاری ضرب بھی۔ جہاں عورت کو صرف مرد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اس دور میں کچھ عورتیں، ایسی بھی ہیں، جو عصمت کی پاکیزگی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ ایسے دوست بھی عنقا نہیں، جو دوست کی آبرو باختہ بیوہ کو اپنانے کی جرأت رکھتے ہیں۔ گویا سماج کی ایک تلخ حقیقت، ہمارے سامنے عریاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "ریت ریت" (ماہانہ شہود، کلکتہ) میں ایک، ایسے شخص سے متعارف ہوتے ہیں جو اپنی بیوی کی ایک بھول پر اسے ہمیشہ کے لئے، چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب اسی نوعیت کی ایک

لغزش اس سے ہوتی ہے، تو اسے اپنی بیوی بے قصور نظر آتی ہے۔ اور وہ پچھتاتا ہوا، اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ "برف کا بت" (مطبوعہ 'مورچہ' گیا) میں ایک ایسے ٹکٹ چیکر کی شبیہ ابھر کے سامنے آتی ہے، جو بلا ٹکٹ سفر کرنے والی عورتوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر، ان کو اپنی ناآسودہ خواہش کا آلہ کار بنا تا رہتا ہے۔ "دریا آگ کا" میں سماجی کشمکش کی واضح تصویر ملتی ہے۔ رجعت پسند اور حریت پرستوں کی درمیانی کشمکش۔ ۔۔۔ بغاوت ۔۔۔ اور کامیاب تحریک کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے باغی حکمراں اور ناکام بغاوت کے آہنی پنجوں کے شکار حریت پسند ۔۔۔ باغی کون ہے؟ یہ کشمکش کیوں؟ اس کا بہت ہی اچھا اور منصفانہ تجزیہ، اس گرانقدر افسانہ میں ملتا ہے۔ جس کا صحیح لطف افسانہ پڑھنے کے بعد ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ "نئی شیش محل" میں علامتی اساطیری انداز میں، ایک زوال آمادہ قوم کے کردار کی کمزوریوں کو حسین علامتی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ "خوابوں کے شہر میں" موجودہ سماجی، سیاسی، اور معاشرتی زندگی کا بھرپور طنز ملتا ہے۔ اور یہ کہانی نئی نسل پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔

جاوید صاحب کا ہر افسانہ، ایک ایسی تصویر کی حیثیت رکھتا ہے، جو سماج کے کسی نہ کسی گوشہ میں، ہمیں نظر آجاتی ہے۔ دراصل یہ تصویریں، ماحول کی سچی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ ہمیں اپنے شہر، گاؤں، محلہ اور پڑوس کے گھروں میں، کہیں بھی مل سکتی ہیں۔ ان تصویروں کا خالق کون ہے؟ یہ تصویریں، ایسی کیوں ہیں؟ ان تصویروں میں تقدس کا فقدان کیوں ہے؟ آخر سرمایہ دار اور غربت کی جنگ کب ختم ہوگی؟ یہ سوالات، ہمارے سامنے، ننگی تلواریں لئے کھڑے ہیں۔ اگر ان کا صحیح جواب اور مناسب حل، تلاش نہیں کیا گیا، تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے بھی سر قلم ہوں گے۔ مفلسی کے دیمک، ہمیں بھی چاٹ جائیں گے۔ یا سرمایہ کی گرمی سے ہمارا وجود جھلس جائے گا۔

جاوید نہال کا ہر افسانہ، اپنے دامن میں، تلخ حقیقت کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مشاہدہ، محسوسات اور تجربات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ فیشن زدہ ادیبوں کی طرح، انہوں نے جدید اسلوب کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے خیالات کو نئے فریم میں پیش کیا ہے

کیونکہ یہ بھی ...

کیونکہ یہ بھی وقت کی ایک ضرورت ہے۔ لیکن یہاں بھی انکی انفرادیت برقرار ہے۔ آواز کی بھیڑ میں، ان کی منفرد آواز' کی شناخت، اہل نظر کے لئے مشکل نہیں۔

کسی بھی ادیب یا شاعر کا مقام، اس کے زمانے میں متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مشاہدہ و مطالعہ کی روشنی میں، رائے ضرور قائم کی جا سکتی ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جاوید نہال نے کم مدت میں، جدید افسانے کی دنیا میں، جو گہرا نقش مرتب کیا ہے۔ اس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ہندوستان کے مشہور ادیب آغا رشید مرزا کی یہ رائے' میرے خیال کی توثیق کرتی ہے۔ "جاوید نہال ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ــــــــــ افسانے وہ ایک زمانے سے لکھ رہے تھے، درمیان میں کچھ تعطل ہوا، اور اب پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا ہے، گویا ایک بجلی ہے جو رک رک کر چمکتی ہے۔ اور ایک گھٹا ہے جو رہ رہ کر اٹھتی ہے۔ اور جب برستی ہے تو جل تھل کر دیتی ہے" [1]

---

[1] ۔ ایک تارہ روشن روشن۔ از آغا رشید مرزا مطبوعہ "سبد گل" کلکتہ۔

میر کے بہتر نشتر

استادِ سخن میر تقی میر کے ۲، نشتر کے بارے میں، مختلف رائیں ہیں.
اس باب میں اصحاب رائے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے. اگر کبھی کسی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی بھی دیتی ہے، تو اظہار بیان الجھا ہوا ہوتا ہے. مقصد الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں بلکہ گول مول بات کہہ کر محض اپنی جان چھڑانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے نشتروں نے مسٔلے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا مسٔلہ، جس میں کوئی الجھنا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی سعی کرتا بھی ہے، تو پرانے تذکرہ نویسوں کے متضاد بیانات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور نتیجے کے طور پر وہ جن تذکرہ نویسوں سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کے خیال کی مناسبت سے خود بھی اظہار خیال کر دیتا ہے۔ الغرض وہ اپنی ذاتی رائے، پیش کرنے سے گھبراتا ہے۔ اور اپنی اس خامی کو چھپانے کے لئے، اپنے سحر طراز قلم سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں ۔ مصنف کی ذاتی رائے جاننے کا خیال، ان کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف انداز سے انکی زندگی کے لطیف گوشوں اور ان کی حیات و شاعری پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر چند باتوں میں قدیم تذکروں کی تحریر کو سچ مان لیا گیا ہے۔ اور مخفی و نمایاں لہجے میں، ان ہی کے الفاظ کی تائید کی گئی ہے. بہتر نشتر بھی، ان بہت سی غلط لیکن مشہور روایتوں میں سے ایک ہے۔
میر جیسا شاعر، جس نے اپنی زندگی کو شاعری کے لئے وقف کر دیا

تھا۔ اور شاعری اس کی زندگی کا اہم جزو بن گئی تھی۔ جس پر یہ مقولہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ تصنیف مصنف کی زندگی ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں " جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو۔ وہ ان کے تمام کلام پڑھکر بغیر کسی تذکرہ کی مدد کے خود بخود ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائیگا"[1] رام بابو سکسینہ کی نظر میں " میر کی زندگی، درد والم کی زندگی ہے۔"[2] سکسینہ نے انگریزی کے شاعر شیلی کی یہ سطور بھی نقل کی ہیں۔" حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیئے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"[3] ایسا شاعر جوار دو غزل کا سرتاج ہو۔ جس کی مدح و ستائش میں نثار احمد فاروقی کے بمطابق خیال " ان کی خدائی کے حضور، ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی بندگی کا اظہار کیا ہے۔ جن کا مسلک مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔"[4] ایسے پُرعظمت شاعر کے کلام کی عظمت کو صرف بہتر اشعار میں مقید کر دینا کہاں تک درست ہوسکتا ہے؟ اہل نظر خوب واقف ہیں۔ ممکن ہے میر کے کلام کے بارے میں آزردہ کی یہ رائے درست ہو کہ " پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلنداست۔" لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ میر کے پست کلام تک بھی، دوسروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

میر نے اپنے زمانے کے ماحول سے متاثر ہو کر فارسی کی تقلید کی ہے۔ اور نتیجتاً کچھ پست اشعار بھی کہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری میں تصنع زیادہ ہے۔ ان کے یہاں آمد کے بجائے آورد کا غلبہ ہے ——— فرسودہ نظریئے کے زیر اثر، کوئی رائے قائم کر کے میر کے اچھے اشعار کی تعداد کو محدود کر دینا، ایک بے معنی سی بات ہے۔ اور میر کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔

زندگی ہمیشہ نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر آنیوالا لمحہ، انسانی زندگی میں نئے انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ادبی زندگی بھی ——— ہر دور کے اثرات کو قبول کرتی ہے۔ اس پر زمانے کی بدلتی ہوئی روِش کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے۔ یہ اپنے ذہن پر ان کے اثرات، مرتب کرتی ہے....

---

[1] ——— دیکھئے مقدمات مولوی عبدالحق — [2][3] تاریخ ادب اردو مترجم مرزا محمد عسکری صفہ ۲۱

[4] ذکر میر مترجم نثار احمد فاروقی

مرتب کرتی ہے۔ اس طرح ہر دور، ایک نئے اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اپنے ماضی و حال کے اثرات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، جو اس کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔ شاعر بھی انسان ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ سرد و گرم ہوا سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ میر بھی انسان تھے۔ اگر انہوں نے اپنی ڈگر سے ہٹ کر، ماحول کا کہیں ساتھ دیا ہے، تو یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسا نہ کرتے، تو یہ بے حسی ہوتی اور کوئی بھی شاعر بے حس نہیں ہوتا۔ کیونکہ جذبات ہی اس کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ جس کی بدولت وہ بلندی پر پہنچتا ہے۔ اس کی شاعری جزو یست از پیغمبری کے لقب سے یاد کی جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد نے اپنے مشہور تذکرہ "آب حیات" میں میر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے متضاد رائے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستّر اور دو بہتّر نشتر باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔"[۱] لفظ "جوہری" اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد کے پاس، اپنے الفاظ کی تائید میں کوئی مستند ثبوت نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے سنی سنائی باتوں پر نشتروں کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی ایسی مستند تحریر ہوتی، جو ان کے قول کی تائید کرتی، تو وہ ضرور نقل کرتے۔

دراصل یہ ایچ آزاد کی رنگین بیانی کی دین ہے۔ آزاد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے ایسے فرضی واقعات کو بھی قلمبند کر دیا ہے، جو سراسر غلط یا مفروضہ تھے۔ آزاد نے "میر کے بہتّر نشتر" سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے، یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ بہتّر کی رقم فرضی ہے۔ کیوں کہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغے میں یہی سنا جاتا ہے کہ یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ایک ہے۔"[۲] اس طرح آزاد کا "بہتّر نشتر" سے منسوب روایت کو فرض کر دانیا، اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد خود بھی، اپنی رائے سے مطمئن نہیں تھے۔ اسی بے اطمینانی کی وجہ سے، انہوں نے غیر شعوری طور پر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی غلط بیانی کو تسلیم کر لیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے ایسا کیوں کیا؟ بظاہر تو اس میں کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے۔ مگر ذہن پر زور

---

[۱]، [۲] "آب حیات" از محمد حسین آزاد ص ۲۳۱

ڈالنے سے ....

ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اس غلط بیانی کا محرک کون ہے؟ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ "آب حیات" میں آزاد نے ذوق کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ ذوق سے ان کی دلی ارادت تھی۔ اور ذوق، سودا سے بہت متاثر تھے۔ لہٰذا قدرتی طور پر آزاد بھی، ان سے متاثر ہوئے۔

میر کے چراغ کے سامنے، سودا کی شمع شاعری مدھم تھی۔ سودا، خود کو دنیائے غزل کا بڑا شاعر سمجھیں، ان کے معتقدین اس خیال کی تائید میں لاکھ سر پٹکیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ میدان غزل میں، میر نے سودا کو مات دیدی تھی۔ ان کا مرتبہ بلند ہے۔ ممکن ہے میر کی اہمیت کو کم کرنے اور سودا کو ان سے بڑا شاعر یا ہم پلہ حریف بنانے کی تڑپ میں، آزاد سے ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو، تو تعجب کی بات نہیں۔ تاریخ ادب اردو کے مصنف سکینہ رقم طراز ہیں۔ "اُن (میر) کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں۔ سب خود انہیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ...... مگر سچ پوچھئے تو ان کے صدہا ایسے اشعار نکلیں گے، جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجہ احسن موجود ہیں۔"[1] المختصر اردو تذکرہ نویسوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اور بعض نے کھل کر، اس کو مفروضہ قرار دیا ہے۔ ان حضرات نے اس پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ میر کے "اچھے اشعار" کو محدود کر دینا، میر کے ساتھ سراسر ناانصافی اور ظلم ڈھانا ہے، ابھرتے ہوئے نقادوں کی نئی پود نے بھی، اس خیال کی مذمت کی ہے۔ جن میں دو صاحبان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ ایک تو یہ ہے "دریا کو کوزے میں بند کیا جاسکتا ہے، سمندر کو نہیں۔ اور میر ایک بیکراں سمندر ہیں۔" دوسری رائے ہے "میر کی شاعری سمندر کی تند لہروں کی مانند ہے، جو اپنے دامن میں خس و خاشاک کو سمیٹے ہوئے بہتی ہے۔"

میر کی شاعری، ایک بیکراں سمندر ہے، جو اپنے دامن میں اتھاہ گہرائی رکھتی ہے محض اس میں سے ابھرتے ہوئے، چند بلبلوں کو دیکھ کر رائے قائم کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر سمندر کی سی وسعت رکھنے والی شاعری میں کچھ خس و خاشاک، آگئے ہیں، تو اسکی

---

[1] "تاریخ ادب اردو" مترجم مرزا عسکری ص ۲۰۶

وجہ سے .....

وجہ سے شاعر کا رتبہ، کم نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا فن محدود ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہی کچھ خامیوں کے پیش نظر، اس کے کلام کے بارے میں غلط رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ بلکہ کوئی رائے قائم کرتے وقت، ایک ترازو کے دو پلڑوں پر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو رکھکر یہ دیکھنا ہوگا کہ کون سا پلہ بھاری ہے۔

میر کی شاعری یاسیت اور قنوطیت سے عبارت ہے۔ مگر یاسیت اور قنوطیت کے باوجود غم کی تیز لے صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہی بلکہ کروڑوں کو اپنا ہمنوا بنا گئی۔ جس کی تاثیر اور حسن تاثیر میں ابدیت ہے۔ اس کی شاعری کی غنائیت، سوز و گداز، نغمگی اور دلکش اسلوب نے میر کو اردو کا سب سے بڑا غزل گو بنا دیا ہے۔ اور اس کے صرف بہتر شعر ہی، نشتر نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے دیوان میں سینکڑوں اشعار ایسے ہیں، جو سحر حلال کہے جاسکتے ہیں۔ اور قاری میر کے غم کو اپنا غم سمجھنے لگتا ہے۔ اسی بنا پر اردو غزل گویوں میں میر کو وہی شاعرانہ عظمت حاصل ہے، جو حافظ کو فارسی غزل گویوں میں اور ہم قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں میر شہنشاہ غزل تھا۔ تاجدار سخن تھا اور اس میدان میں، اس کا کوئی حریف نہیں۔

ادب سے سماج کا رشتہ

انسان، اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے ذہن پر ماحول اور زمانہ کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔ کم و بیش ہر شخص اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یہ اثرات خوشگوار بھی ہو سکتے ہیں اور مضرت رساں بھی۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد "نہیں" کے برابر ہوتی ہے۔ ایسی شخصیتیں شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

ہر دور اپنا ایک منفرد مزاج رکھتا ہے۔ وہ نئے خیالات، رجحانات اور نئی باتیں اپنے دامن میں لے کر جلوہ گر ہوتا ہے ——— نئے اثرات، قبول کرتا ہے۔ ایک نئے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ دراصل زمانہ کبھی ایک روش پر نہیں چلتا بلکہ شطرنج کے مہروں کی طرح، اس کی چال بھی بدلتی رہتی ہے۔ گرگٹ کی طرح زمانہ کا بدلتا ہوا رنگ، انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا سماج و ادب سے۔ خواجہ الطاف حسین حالی "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں:-

" قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے۔ اسی قدر شعر کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے ارادہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی

کے ساتھ ساتھ...

کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بدلتا چلا جاتا ہے۔" [۱]

خواجہ حالی کے خیالات کی تصویر کے نقوش کو سید ضمیر حسن دہلوی کے یہ الفاظ اور بھی واضح کرتے ہیں۔

"جس طرح شاعری اپنے گرد و پیش کے مذاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح نثر میں موضوعات اور اسلوب نگارش کا تعلق ماحول کے مروجہ مذاق پر ہوتا ہے۔" [۲]

زمانہ یا ماحول کی تبدیلی کا باعث، اول تو وہ حالات ہوتے ہیں۔ جو غیر محسوس طور پر زمانہ کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کی فطرت کو پیوند لگے باس کی جگہ، ایک نیا لباس دے کر اس کی پژمردگی کو ولولوں میں بدل دیتے ہیں۔ عام طور پر زمانہ کی تبدیلی میں، سیاسی امور بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر سیاست کی لہریں اپنا رخ نہیں موڑتی ہیں، تو بھی سماج کے اندر تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سماج کی بوڑھی کوکھ میں ـــــــــــ نئے نقش و نگار ابھرتے ہیں۔ گویا جوانی بوڑھاپے کا لباس پہن کر "قبرستان" کی بوجھل آبادی میں، اضافے کا سبب بنتی ہے۔ یا چتا کی خاک کا وزن بڑھاتی ہے۔ اور پھر اسی خاک سے زندگی کا نیا پودا، پوری توانائی کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔

موت کے خونی پنجے۔ انسان کی زندگی کو تاریک بناتے ہیں۔ تو زندگی کی "نئی لہریں" سماج کو نئی روشنی سے نوازتی ہیں۔ ماحول کی بوسیدہ عمارت کو "نئی شکل" اور زمانہ کے مزاج کو نئی توانائی ملتی ہے۔ اس طرح موت کی تاریکی سے، زندگی کا نور پھوٹتا ہے۔ نئی آبادی، نئے اور اچھوتے خیالات و رجحانات کو جنم دیتی ہے۔ جس کی جھلک اس وقت کے معاشرہ میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

سیاسی اور سماجی تبدیلی کا اثر براہ راست یا بالواسطہ ادب پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ زبان و ادب کے دامن میں بھی، ترقی کے روشن ذرات بکھرتے ہیں۔ اور ادب کا دامن نئے اضافوں

---

[۱] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ سید احمد رضوی ایم۔ اے ص ۲۳

[۲] فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ص ۹

کو قبول کرتا ہے، زبان میں نئی اور موثر تبدیلیاں آتی ہیں۔ اور یہ زبان میں حرارت اور ادب کی ترویج و اشاعت میں، اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہ الفاظ، روایت پرستوں کیلئے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

> "اگر روایت اور ترکہ اسی کا نام ہے کہ پہلی نسل کی کامیاب باتوں پر آنکھیں موند کر عمل کیا جائے۔ یا ڈرے ڈرے سہمے سہمے انداز میں اس راستے پر چلا جائے تو پھر ایسی روایت کو یقینی طور پر مردہ ضرور قرار دینا چاہیئے۔"

ادب کا زندگی سے گہرا ربط ہے۔ وہ اپنے ماحول کا عکاس ہوتا ہے، مجنوں گورکھپوری نے بھی اس خیال کی صداقت کا اعتراف کیا ہے "کامیاب ترین ادب وہ ہے، جو ماحول کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو" گویا ادب اپنے ماحول کا عکاس ہی نہیں بلکہ اشاریہ بھی ہوتا ہے۔ ممتاز حسین کی نظر میں "ادب کا تعلق براہ راست انسانوں کی زندگی سے ہے۔ ان کے نفسیاتی منظر سے جن کا مطالعہ کسی بھی طبقاتی سماج میں غیر جانبدارانہ ہو سکتا ہے۔" اس باب میں اطہر پرویز کا کہنا ہے۔ "ادب انسانی تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے بہترین خیال کو بہترین الفاظ میں، بہترین حسن ترتیب کے ساتھ محفوظ کرتا ہے۔"[1] ڈاکٹر نورالحسن کی یہ رائے بھی، جاذبیت رکھتی ہے "ادب کا بنیادی تعلق محض جذبات و احساسات سے ہے۔"[2]

ناقدان فن کی آرار کی روشنی میں، ہم ادب کے لفظی و معنوی گہرائی سے بہت حد تک قریب ہو گئے ہیں۔ اور ادب کے حسن کی شعاعیں، ہمارے پردہ ذہن پر بکھر گئی ہیں۔ لہٰذا ہم "اچھے ادیب" کا جائزہ بھی لیں گے۔ تاکہ ہمارا ذہن، ان خصوصیات کے گرد احاطہ کر سکے، جو بڑا ادیب بناتی ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر اعجاز حسین کے یہ الفاظ، قابل غور ہیں:۔

> "کوئی زبان اچھا ادیب نہیں پیدا کر سکتی۔ جب تک اس کے خدمت گزاروں کو قوت مشاہدہ کے ساتھ نکتہ رسی نصیب نہ ہو،

---

[1] ادب کا مطالعہ، از اطہر پرویز، ص ۳۰ [2] ادب کا مقصد، از نورالحسن ہاشمی ص ۹

اسی کے ساتھ....

اسی کے ساتھ قوت ایقان کی بھی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک اس کے احساسات اعتقاد کی صورت نہ اختیار کریں گے۔ نہ ان میں زور پیدا ہوگا اور نہ سننے والے اس سے خاطر خواہ متاثر ہوں گے۔"[1]

ڈاکٹر سیفی پریمی کے "فنکار" کو ان کی "تحریر" کے "آئینہ" میں دیکھئے:۔

"ہر فنکار کے سامنے اس کے عصری تقاضے ہوتے ہیں۔ تہذیب کے رشتے، سوسائٹی، رجحان طبع، اور ذاتی مطالعے سے اس کے ذہن کی ساخت پرداخت ہوتی ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ اس کا اپنا ایک واضح نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کے ذہن کو ہم خلاق ذہن کہتے ہیں۔"[2]

کسی بھی فنکار کی تخلیق اور اس کے فن کی گہرائی سے واقف ہونے کے لئے صرف، اس کے دور کا مطالعہ ہی کافی نہیں۔ بلکہ اس کی سماجی، اقتصادی اور گھریلو حالات کی پرکھ اور سماجی و ادبی ماحول سے واقفیت از حد ضروری ہے۔" ایک ہی دور سے تعلق رکھنے کے باوجود، ادیب و شاعر، مختلف حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ کے پیش نظر غالب، مومن اور ذوق ایک دور کے شاعر ہونے کے باوجود، ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ غالب کی شاعری میں ایک ایسے جھنجھلائے ہوئے" فنکار" کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جو امراء کے طبقہ سے متعلق ہونے کے باوجود مفلسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ جبکہ مومن کی شاعری میں ایک خوش حال انسان کی آسودگی کا عکس نمایاں ہے۔ اور ذوق کی شاعری میں "اخلاق" کی جا بجا جھلک ملتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی صلاحیت کی وجہ سے، ایک بلند مرتبہ شاعر اور بادشاہ وقت کے درجہ تک پہنچے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا دامن "ماضی" سے نہیں بچا سکے، جہاں ان کے ذہن کی ابتدائی نشو و نما ہوئی تھی۔ اور اسی ذہنی لگاؤ نے انہیں "بولی ٹھولی" کی شاعری کرنے پر بھی مجبور کیا۔

فنکار کے ذہن پر اس کے پیشہ کا بھی اثر پڑتا ہے۔ مومن، طبیب تھے اور علم نجوم سے انہیں

---

[1] ادب اور ادیب، ص ۹، ص ۱۱ [2] جگر بریلوی فن اور شخصیت ص ۱۰

گہرا شغف تھا۔ لہٰذا ان کی شاعری میں طب اور نجوم سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ میر درد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے، یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ صوفی تھے۔ اور تصوف سے، ان کا صرف ذہنی ہی نہیں بلکہ دلی لگاؤ تھا۔

زبان و ادب جامد نہیں، اس کے اندر تحریک کی برقی لہریں، ابھرتی رہتی ہیں۔ یہ تغیر زندگی کی علامت ہے۔ اور اسی تغیر و تبدل کی بدولت، نئے خیالات و رجحانات فروغ پاتے ہیں۔ ترقی کی نئی راہیں وا ہوتی ہیں، زبان میں تراش خراش ہوتی ہے، جو اس کی بناوٹ میں، تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح بہت سے پرانے نقوش، نئی تبدیلیوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جو اپنے زمانہ میں کارآمد اور جاذب نظر تھے۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات نے ان کی وقعت گھٹا دی ہے۔ بلکہ گمنام گھاٹیوں میں، بہتیرے الفاظ، دفن ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں، سید ضمیر حسن دہلوی کے یہ الفاظ 'دعوت مطالعہ' دیتے ہیں۔

"زبان میں بے شمار الفاظ کسی خاص زمانے کے رواج، رسوم اور عقائد کے تحت داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے، معاشرت کے تاریخی پس منظر سے واقف ہونا ضروری ہے۔" [1]

سید احتشام حسین کے یہ الفاظ، حقیقت پر مبنی ہیں:-

"انسان ابتدا ہی سے سماجی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ سماج کو بدلتا ہے اور سماج کے ساتھ خود بدلتا رہتا ہے۔ سماج کو بنانا اور سماج کے ساتھ خود بنتا رہتا ہے۔ زبان و مکان کی وسعت میں یہی تغیر ہے جس نے علم الاساطیر، دیومالا مذہبی کہانیاں، داستان، افسانے اور ناول پیدا کئے۔" [2]

انسانی زندگی میں مشاہدہ اور مطالعہ کی اہمیت مسلم ہے۔ جو تجربہ کی بنیاد بنتے ہیں انسان اپنے موہوم خیالات و تاثرات کو وسعت دیکر ایک تصویر یا پیکر کی تخلیق کرتا ہے۔ اور یہ پیکر ہر دور میں بنتے اور بگڑتے اور بدلتے رہتے ہیں۔

---

[1] فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ص ۶ ، [2] روایت اور بغاوت ص ۱۴۹ ، ص ۱۵۰

ہر دور اپنے ....

ہر دور اپنے دامن میں نئے خیالات کے دھارے لیکر آتا ہے۔ ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ ہر زمانہ کا انسان، ایک نیا انسان ہوتا ہے۔ جس کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز، ماضی کے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے رہن سہن، طور طریقہ رسم و رواج حتیٰ کہ تہذیب و تمدن میں بھی تبدیلی آتی ہے کارلائیل نے کیا اچھی بات کہی ہے "کوئی انسان سترہویں اور انیسویں صدی میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتا۔" کیونکہ ہر دور کی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں اور یہی ضرورتیں فنکار کے خیالات کو وسعت اور اس کی فکر و نظر کی تعمیر کرتی ہیں۔ اس کو "لائحہ عمل" بنانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ لہٰذا ہر شاعر و ادیب یا فنکار، اپنے ماحول کا پرتو ہوتا ہے۔ وہ اپنے تغیر پذیر ماحول کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اپنی تحریریں نئی تبدیلیوں کو راہ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ان تبدیلیوں سے، اس کا اسلوب بھی متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کی مدد سے بھی، ہم اس زمانہ کے ادب اور زبان سے متعلق بہت سی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔

صداقت پسند فنکار، حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے احساس و شعور پہ زمانہ کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے اندر ہونیوالی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتا ہے، غور و فکر کرتا ہے۔ اگر شاعر ہے تو اپنے خیالات کو شعری پیکر میں ڈھال دیتا ہے، ادیب ہے تو اپنی نثری تخلیقات میں، اپنے احساس و خیالات کا جابجا اظہار کرتا ہے۔ افسانہ نگار ہے تو اس کے افسانے، سماج کے گرد حصار ڈالتے ہیں۔ اردو مثنویوں ہی کو دیکھئے۔ وہ اپنے دور سے متعلق ایسے معلومات فراہم کرتی ہیں۔ جو تاریخ کی کتابوں میں بھی دستیاب نہیں۔ افلاطون کا یہ خیال صداقت سے خالی نہیں کہ " تاریخ کی نسبت شاعری حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔"

بلاشبہ تصنیف، مصنف کی زندگی ہوتی ہے۔ اور مصنف اپنے ماحول کی دین ہوتا ہے۔ لہٰذا تصنیف کو سمجھنے کے لئے، مصنف کی داخلی زندگی کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اور اس کے ماحول سے بھی کما حقہٗ واقفیت حاصل کرنی ہوگی۔ بغیر مصنف کے دور کا مطالعہ کئے ہوئے، ہم اس کی تخلیق کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ اس کے متعلق حتمی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

کسی فنکار کے مقام کا تعین، اس کے دور کی روشنی ہی میں۔ کیا جا سکتا ہے کیونکہ بدلے ہوئے حالات، الفاظ کو نئی شکل اور تلمیحات کو بھی، نئے معنی دیدیتے ہیں۔

باب ۲
بنگال میں اردو کا سفر

زبان کا تعلق انسان کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ قوم زمانہ میں ترقی کی منازل طے کرنے سے قاصر رہتی ہے، جو اپنی کوئی مخصوص زبان نہ رکھتی ہو۔ کسی بھی قوم کی زندگی اور ترقی کا راز۔ اس کی اپنی زبان میں مضمر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر قوم اپنے خزینۂ ادب کو اپنی مخصوص زبان میں محفوظ رکھتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ زبان کو مذہب سے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ اور اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اس کی مخالفت یا موافقت کی جاتی ہے۔ یہ بدعت اردو کے ساتھ بھی ہے۔ اس کو مسلمانوں کی قرار دیدیا گیا ہے۔ یہ بات کسی حد تک تو درست ضرور ہے۔ مگر اس کو بالکل صحیح تسلیم کر لینا، انصاف کے منافی ہے۔ کیونکہ اسلام، ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اس کے ماننے والے، دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ان سبھوں کی زبانیں مختلف اور الگ ہیں۔ ان کا "اثاثۂ فکر" ان کی اپنی زبان میں محفوظ ہے۔

اردو ہندوستان کی ایک مقبول انام زبان ہے، جو اس دیار میں پیدا ہوئی۔ پلی اور بڑھی ہے۔ ہندوستانیوں نے بلا تفریق مذہب و ملت، اس زبان کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ ایمانداری کے ساتھ، لسانی تاریخ پر اگر کوئی نظر ڈالیگا، تو اس کو خود بخود یہ احساس ہوگا کہ جس زبان کو وہ غیر ملکی کہہ رہا ہے اور مثال بہم پہنچانے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ وہ اس کی اپنی زبان ہے، جو اس کے بزرگوں کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں سے وجود میں آئی ہے۔ یوں تو پنجاب و

دکن اور ....

دکن، دلی و لکھنؤ اور عظیم آباد نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس زبان کی جو خدمت کی ہے، وہ تاریخ زبان و ادب میں روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنگال نے بھی، دوسری ریاستوں کی طرح، اردو کی ترویج و اشاعت اور ترقی و توسیع میں، اپنی بساط بھر کوشش کی ہے۔

اردو کے ابتدائی نقش و نگار کا بنگال میں دستیاب ہونا، بادی النظر میں حیرت انگیز بات ہو سکتی ہے۔ مگر اردو کی قوت کشش اور سیمابی کیفیت یعنی پھلنے پھولنے اور اپنے لئے موافق حالات پیدا کرنے کی صلاحیت کے پیش نظر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ذرا تصور کیجئے بنگال جیسی دور افتادہ ریاست میں، جہاں کی مقامی زبان بنگلہ جیسی ترقی یافتہ اور مؤثر زبان ہو۔ وہاں اردو کو قدم جمانے نیز فضا میں چھانے کے لئے، کتنی مشکلات اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہاں کے حالات دلی، لکھنؤ اور دکن سے مختلف تھے۔ پھر بھی مرشد آباد اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا وجود، بنگال کی سربلندی کے لئے کافی ہے۔ تحقیقی زاویئے بتاتے ہیں کہ قادریہ اور چشتیہ خاندان کے بزرگ اور ان کے متعلقین، بنگال پر مسلمانوں کے قابض ہونے سے قبل، یہاں آگئے تھے۔ اور تبلیغ و اشاعت کا کام بخوبی انجام دے رہے تھے۔ اس وقت "پنڈوا" کو اہم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

صوفیوں کی زبان عربی و فارسی تھی۔ اور مقامی زبان "بنگلہ" تھی۔ لہٰذا صوفیوں کو تبلیغ و اشاعت مذہب کے سلسلے میں، سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت اس "بولی" نے جس کو ہم "کھڑی بولی" یا اردو کی کثیف شکل کہہ سکتے ہیں۔ اسی بولی نے صوفیا کو سہارا دیا۔ ٹیری نے اسی کو "کباڑیوں کی زبان" کہا ہے اور اب وہ "کلکتیا بولی" یا "کلکتیہ اردو" کہلاتی ہے۔ جس کو "بنگالی اردو" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک کے جرنیل بختیار الدین خلجی نے بنگال پر حملہ کیا اور راجہ سین کو شکست دیکر، بنگال کو فتح کیا۔ اس وقت شمالی ہند میں کھڑی بولی (اردو) مقبول ہو چکی تھی۔ وہ مسلم سپاہیوں، افغان پٹھانوں اور صوفیائے کرام کے ساتھ، باضابطہ بنگال پہنچی۔ سپاہیوں، پٹھانوں اور صوفیا نے یہاں شادیاں کیں اور اکثر نے بنگال کو وطن ثانی کا درجہ دیا۔

اس طرح....

اس طرح بنگال میں "کھڑی بولی" (اردو) نے قبول عام کا درجہ حاصل کیا۔ اور بنگالی و غیر بنگالی اشخاص کے درمیان میں، رابطہ کی زبان بنی۔ امیر خسرو نے اس بولی کو "ہندی" کہا ہے۔ وہ "غرۃ الکمال" میں لکھتے ہیں "ہندی زبان ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہے۔" اس طرح "کھڑی بولی" بنگال میں "خانقاہوں" سے نکل کر، گلی کوچے میں، پھیل گئی۔

اردو (کھڑی بولی) اور بنگلہ، نہ صرف ہمعصر زبانیں ہیں بلکہ انکی نشو ونما کا ابتدائی دور بھی، ایک ہے۔ ان دونوں زبانوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کا اثر قبول کیا ہے۔ تقریباً پانچسو عربی و فارسی اور اردو کے الفاظ، بنگلہ زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً تاریخ، آتش بازی، وکیل مقابلہ، انقلاب، بدمعاش، منظور، درخواست وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہیں، جو بنگلہ زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو نے بنگلہ سے دست وگریباں ہونے کے بجائے، اپنے لئے "نئی راہ" بنائی ہے اور اسی پر گامزن ہے۔ اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی فضا میں سانس لیتی ہے، جو بسا اوقات اس کے دامن کو خاردار جھاڑیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اردو داں بھی بعض خصوصیات کی بنا پر اردو کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بنگالی ہندوؤں نے بھی، اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں!

> "اردو شاعری اور ادب میں بنگال کی اہمیت مسلم ہے۔ مثلاً بنکم چندر چٹرجی، مہارشی ٹیگور اور نذر الاسلام کی تصانیف کا۔ علم لسان سے میری واقفیت بہت کم ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا، لسانی ہیئت وحیثیت اور ساخت پرداخت کے اعتبار سے بنگالی زبان کا، اردو زبان پر کیا اثر ہے البتہ ایک بنگالی نے براہ راست اردو کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں (ملاحظہ ہو شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تالیف) اس کا معترف ہوں۔ میں اس تالیف کو اردو میں ایک مستند اور قابل تعریف اضافہ سمجھتا ہوں۔" [1]

اردو ادب میں بنگال کی اہمیت لسانی وادبی، دونوں اعتبار سے مسلم ہے۔ اگرچہ اردو

---

[1] دیکھئے "مغربی بنگال میں اردو ادبی سرگرمیاں" مطبوعہ "سدگل" کلکتہ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء

زبان و ادب کی تاریخ میں، یہ ایک پس ماندہ صوبہ کی حیثیت سے متعارف ہے۔ لیکن اس صوبہ میں زبان و ادب کی جڑیں اتنی ہی گہری، مکمل اور پائیدار ہیں۔ جس طرح دکن، پنجاب، سندھ، دلی لکھنؤ اور عظیم آباد میں۔ چونکہ بنگال ایک دور افتادہ ریاست ہے، لہٰذا اردو کے محققوں، ناقدوں اور ماہر لسانیات کی نظروں سے، یہاں کی اردو ادبی سرگرمیاں اوجھل رہی ہیں ـــــ مقامی اور با اثر زبان بنگلہ سے بھی، اردو یہاں نبرد آزما رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کی باہمی کشمکش کس نوع کی ہے؟ یہ ایک تفصیل طلب امر ہے۔ پھر بھی اس مضمون میں کچھ اشارے ملیں گے۔ الغرض ان حالات میں اردو کو یہاں اپنی خاص جگہ بنانے اور منفرد مقام حاصل کرنے کے لئے، جن صبر آزما گھڑیوں اور کٹھن راہوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس سے اہل علم خوب واقف ہیں۔

ہندوستان بالخصوص بنگال میں اردو کی حیثیت کسی بیرونی زبان کی نہیں بلکہ دیگر صوبوں یعنی سندھ، پنجاب اور شمالی ہند کے علاقوں کی طرح، یہاں بھی اردو، اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھی۔ وفا راشدی نے بھی، اس جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "اردو کی ابتدا کسی خاص صوبے سے منسوب کرنا ہرگز قرین قیاس نہیں" [1] ان الفاظ کی صداقت سے، شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ حضرت ناطق لکھنوی کے یہ الفاظ بھی، غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

> "اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمائیے جو شمالی پہاڑیوں سے جاری ہوا۔ دلی میں آکر دریا بنا۔ اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں۔ ایک بنگال کو گئی، ایک بہار کو۔ ایک اودھ کو اور ایک گجرات کو۔ یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام ہندوستانی خصوصاً آگرہ اور دلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنؤ میں صاف کر کے نہریں دوڑا دیں" [2]

علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

> "یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال، ہر جگہ کی

---

[1] بنگال میں اردو ص ۴ [2] نظم اردو ص ۱۵

صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی ہے۔" [۱]

جبکہ حافظ محمود شیرانی کا کہنا ہے :-

"اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست مرکز دلّی ہے۔ جو دکنی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کلکتہ پہنچ کر عام ہو جاتا ہے۔" [۲]

فرانس کے مشہور عالم اور مورخ گارساں دتاسی کے یہ الفاظ، خاص اہمیت رکھتے ہیں :-

"اردو کے مرکزی شہر ہیں :- دلّی، آگرہ، لاہور، میرٹھ، لکھنو، بنارس، کانپور، مرزاپور، فیض آباد، الٰہ آباد اور کلکتہ، جہاں ہندوستانی صوبہ جاتی زبان کے بولی جاتی ہے۔" [۳]

اور بنگال کے ممتاز محقق ڈاکٹر جاوید نہال رقم طراز ہیں :

"کوئی معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اردو زبان نے بنگال میں جنم لیا۔ تاہم یہ دعویٰ یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ کلکتہ کو اگر شعری ادب میں نہیں تو نثری ادب میں سنگ میل کی حیثیت ضرور حاصل ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے اس کاسموپولیٹن شہر میں نثر کی نشوونما پر سب سے پہلے توجہ کی گئی اور سر جان گلگرسٹ کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج میں نثر کا ننھا سا پودا سینچا گیا" [۴]

اردو تحقیقی زاویے بتاتے ہیں کہ آٹھویں صدی ہجری میں یہاں مخدوم اشرف جہانگیر جیسے باکمال موجود تھے۔ جن کے تذکرے اور نمونہ کلام دستیاب ہیں۔ مخدوم اشرفؔ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ہمعصر تھے۔ قُلنسؔ (برگاڈنی کا مصنف) حسین شاہ کا درباری شاعر تھا۔ حسین شاہ علم دوست تھا۔ اس کے زمانے میں اردو نے ترقی کا ایک نیا دور دیکھا۔ قلنسؔ ۹۰۹ھ میں، بادشاہ کی مدح میں گویا ہے ؎

---

۱ نقوش سلیمانی ص ۹۶ ۔ ۲ پنجاب میں اردو ص ۱۳ ۔ ۳ خطبات ص ۱۱۱
۴ دیکھئے انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔

شاہ حسین ...

شاہ حسین آہے بڑا راجہ ⁂ چھتر سنگھاسن ان کو چھایا

قلندر کے ہمعصر شعراء میں بہاء الدین باجن (۹۱۲ھ) تھے۔ ان کا شعر ہے ؎

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے ⁂ اس سے ارجن تھر تھر کانپے

قلندر اور باجن کی شعری زبان میں کیا فرق ہے؟ ان دونوں کی زبان میں مماثلت نہیں؟ حال میں ایک نثری تحریر سامنے آئی ہے، جس کا تعلق سولہویں صدی سے ہے:

"جہاں عالم بادشاہ تخت اوپر سکھے تھے بادشاہی کرے۔ خوش حال اتنے سات ملگیر، بادشاہ عالم کما کتا سرانجام تا اللہ کے معلوم" [1]

اس تحریر کی روشنی میں ڈاکٹر جاوید نہال کا یہ دعویٰ غلط نہیں ـــــ کہ "اردو نثر کا جنم بھوم کلکتہ ہے" اردو لسانیات سے تعلق رکھنے والوں کیلئے "کلکتیا بولی" یا "کلکتیہ اردو" (جس نے اب زبان کا درجہ حاصل کر لیا ہے) کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق "مشرقی ہندی" سے ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ یہ کھڑی بولی کی کثیف شکل ہے۔ اور ٹیری نے اپنی معروف کتاب "مشرقی ہند کا سفر" (۱۶۵۵ء) میں اس بولی کو "کباڑیوں کی زبان" سے تعبیر کیا ہے۔ ابراہیم ہوش (مدیر آبشار کلکتہ) اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے پہلی بار "کلکتیا اردو" میں شاعری کی اور مضامین لکھے۔ ان کی شعری تصنیف "جندگی کا میلا" (زندگی کا میلہ) کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح کلکتیا بولی نے "زبان کا درجہ" حاصل کیا۔ بطور نمونہ ایک شعر مندرج ہے ؎

رسکا آلا دوڑا جا ہے ⁂ جیسے کوئی گھونڑا جا ہے

مغربی بنگال میں اردو ادب

مغربی بنگال میں اردو ادب کا جائزہ لینے کے لئے اسکو دو خاص حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:-

۱۹۴۷ء سے پہلے کا دور

آزادی کے بعد کا دور

---

[1] بنگال میں نثر نگاری، مطبوعہ آبشار، کلکتہ [2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۵۹۲

آزادی سے....

آزادی سے پہلے "مشترکہ بنگال" میں زبان و ادب کے سلسلے میں، باضابطہ اجتماعی کوشش فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ ہوئی۔ اردو نثر کی ترویج و اشاعت میں، اس نے موثر و اہم کردار ادا کیا۔ اس کے منشیوں کی خدمات مستحسن ہیں۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خاص طور پر میر امن دلی والے (باغ و بہار) حیدر بخش حیدری (توتا کہانی۔ قصہ حاتم طائی) نہال چند لاہوری (مذہب عشق) کاظم علی جوان (شکنتلا ناٹک) میر بہادر علی حسینی (اخلاق ہندی) خلیل علی خاں اشک (داستان امیر حمزہ) مظہر علی خاں (بتیاں پچیسی) شیر علی افسوس، للو لال کوی، منصور علی حسینی، لالہ کھتری رام، نور خاں، نور علی، نثار نانتوی، باسط خاں، قائم خاں اور مرزا لطف[1] وغیرہم نے بھی اردو کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں اردو کا دائرہ جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تک پھیل چکا تھا۔ اور اردو کے سلسلے میں مرشد آباد کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ نواب مخلص، قدرت اللہ قدرت، ماشاءاللہ خاں انشا، اور جودت کی شہرت، ہندوستان بھر میں کسی سیال مادے کی طرح پھیل گئی تھی۔ اس باب میں سیرام پور مرکز کی اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سیرام پور مرکز میں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ، محمد فقیہہ دردمند، شاہ قدرت اللہ قدرت، انشا، ماشاءاللہ خاں صفدر،

---

[1] اصل نام مرزا کاظم علی ہے، تخلص لطف ہے۔ آپ دلی میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت کے سلسلے میں، اختلاف رائے ہے۔ تحقیقی زاویے بتاتے ہیں کہ ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیانی وقفہ میں، آپ عالم ظہور میں آئے۔ دلی کی بربادی سے مایوس ہو کر، رخت سفر باندھا۔ اور تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں عظیم آباد گئے۔ مگر بدقسمتی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا مرشد آباد تشریف لائے اور یہاں شیر علی افسوس سے (۱۸۰۱ء) ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی شہرت بام عروج پر تھی، اس کی شہرت سے متاثر ہو کر ۱۸۰۱ء میں کلکتہ تشریف لائے۔ اور مؤلف ارباب نثر اردو کے بقول "مرزا لطف علی ۱۸۰۱ء میں گلشن ہند کی تالیف سے فارغ ہو کر حیدرآباد آئے اور نواب آصف جاہ بہادر اور اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں قصائد لکھ کر گذارے ....."

مرزا علی لطف نے "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ "گلشن ہند" کے نام سے کیا۔ اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا۔ مرزا لطف نے پہلی بار مخلص علی خاں مخلص (مرشد آباد) کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ بعد میں گارساں دتاسی

(بقیہ ص ۷۶)

نواب میر ....

نواب میر محمد شرق، میر امیر علی آشنا، سید اسد علی ثریا۔ **اور مرشد آباد میں** انثار، آشنا، جودت، ہردی رام۔ مخلص، قدرت، کے نام قابل ذکر ہیں۔ مرشد آباد اور سیرام پور مرکز کے

اور کریم الدین نے بھی مخلص کے متعلق، تفصیل سے لکھا ـــــــ لطف کی "مثنوی لطف" کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ترتیب دیکر شائع کیا ہے۔ اور "تذکرہ گلشن ہند" کو ڈاکٹر عبدالحق نے مرتب کر کے، شائع کیا ہے۔

مرزا لطف، بلند پایہ شاعر تھے، ان کی شاعرانہ زندگی کی جھلک، مختلف تذکروں میں محفوظ ہے۔ لیکن "دیوان لطف" ـــــــ مرزا لطف کے بارے میں، تسلی بخش معلومات کی کمی کے باعث، بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں ان کو میر تقی میر کا شاگرد بتایا ہے جبکہ "سخن شعراء" میں نساخ نے شیفتہ سے اختلاف کرتے ہوئے، لطف کو سودا کے حلقہ تلامذہ میں، شامل کر دیا ہے۔ حالانکہ لطف نے فارسی میں اپنے والد کاظم بیگ اشتری سے اصلاح لیتے تھے۔ اور ریختہ میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ تذکرہ گلشن ہند میں، انہوں نے کھلے لفظوں میں لکھا ہے۔" اصلاح فارسی کی اس ہیچ مداں کو آپ (کاظم بیگ خاں) ہی کی جانب سے اور مقررہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔"[۵] لطف میر و سودا کی شاعری سے متاثر تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ تذکرہ نویسوں سے چوک ہو گئی۔

میری تحقیقی کاوشوں نے مجھے" دیوان لطف" دیا ہے۔ یہ دیوان تختی سائز اور ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا ہے:-

" مَاشَآءَاللّٰہُ لَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

حسب فرمائش جناب حاجی محمد سعید صاحب تاجر کتب کلکتہ خلاصی ٹولہ نمبر (۸۵)



(بقیہ ص ۸۰)

دوش بدوش...

دوش بدوش ہوگلی نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ **ہوگلی کے شاعر و ادیب** قاضی محمد صادق خاں اختر، سید حافظ اکرام احمد ضیغم، رشید النبی وحشت، عصمت اللہ نسخ، رند، مسخور اور امید علی خاں امید کے بغیر بنگال کی اردو ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں صمصام حیدر نور، عبدالکریم آشنا، قادر بخش خفوتی، شیخ باقر فنا، مظہر وصل، واتی، بیدل ہوگلوی، نواب جان قمر کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ اس طرح **کلکتہ اور مٹیا برج کے شعراء میں** عبدالغفور خاں نساخ، ابوالقاسم محمد شمس، محمد علی داؤد ناداں، سید مرشد القادری، قاضی عبدالمجید، علی حیدر نظم طباطبائی، نواب سید محمد آزاد، کی شخصیت روشن ہے۔ صوفی شعرائے کرام میں حضرت صادق علی شاہ، خواجہ مورکھ شاہ، مسکین علی شاہ چشتی اور خواجہ کلیم الدین شاہ کے نام، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صادق شاہ اور مسکین علی شاہ (مسکین شاہ صادقی) صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اور مورکھ شاہ و کلیم شاہ کے مخطوطہ دواوین موجود ہیں۔ یہ صوفیائے کرام سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت

باہتمام احقر العبید راجی رحمتہ رب رشید محمد شفیع عفرلہ اللہ الحمید، در مطبع مجیدی واقع کانپور مطبوع“

_____ دیوان کے آخری صفحہ پر ”تمت خاتمۃ الطبع“ کے تحت، یہ سطور مندرج ہیں ”الحمداللہ والمنۃ کہ دیوان لطف مع سراپائے رسول اکرمؐ و خمسہ جات و مناجات و معراج نامہ و غزل مولوی محمد سعید صاحب مطبع مجیدی واقع کانپور میں باہتمام راجی رحمت رب البصیر السمیع حاجی محمد شفیع صاحب ابن حاجی محمد سعید صاحب بماہ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۲۴ء کو مطبوع ہوا۔“[۵۳] یہ دیوان مطبع احمد کانپور سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوا، صفحات ۶۰ ہی ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں، یہ دیوان، حسب فرمائش منشی گلاب سنگھ، مطبع مفید عام پریس لاہور میں چھپا ہے، جس کے مالک بھی منشی گلاب سنگھ ہی تھے۔ اس دیوان کے صفحات ۵۶ ہیں۔

متذکرہ سطور کی روشنی میں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ”دیوان لطف“ دراصل مرزا علی لطف ہی کا دیوان ہے۔ اس دیوان میں جا بجا تصوف کے رموز و نکات بیان ہوئے ہیں۔ اور مرزا علی لطف کا خاندان بھی، صوفیانہ عقائد کا گرویدہ تھا۔ لطف کے والد پیری مریدی کے قائل تھے۔ جیسا کہ لطف کے ان الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے ”اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن استر آباد، شجاعت بنیاد کے ہیں۔ گیارہ سو چون ہجری (۱۱۵۴ھ) میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہاں آباد تشریف لائے اور

(بقیہ ص۸۰ پر...)

کے ساتھ ...

کے ساتھ، زبان و ادب کی خدمات بھی انہوں نے انجام دی ہیں، جو گرانقدر ہیں۔

مغربی بنگال میں ۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء یعنی ۵۰ سال کا عرصہ، اردو شعر و ادب کے لئے زریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے فنکار ہیں قاضی محمد صادق خاں اختر، سید حافظ اکرام احمد ضیغم، ابو محمد عبد الغفور خاں نساخ، غلام کبریا کامل، آقا احمد احمد، نواب سید محمود آزاد، سید محمد آزاد، پروفیسر محمد عبد الغفور شہباز، خواجہ عبد الغفار اختر، عبد الرحیم صبا، خواجہ عتیق اللہ شیدا، خواجہ محمد اشرف، حاجی منشی عبد اللہ آشفتہ، مرزا محمد عسکری عیش، غلام خاں تمکین تمنا اور لوڈی کاٹا وغیرہ۔ شمس، انسخ اور خالد کے ہمعصر شاعر و ادیب۔ خواجہ محمد افضل، چودھری عظمت اللہ انسخ، ابوالقاسم محمد شمس، میر حسین مرزا مرق، محمد فیض بخش حسرت، منشی محمد سیف اللہ خاں جوہر، نواب احسن اللہ شاہین، عبد الکریم آشنا،

ابو المنصور جنگ کی وساطت سے کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی۔ مصدر عنایت بادشاہی ہوئے۔"[۳]

دیوان لطف کے ردیف الف والی پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا ؛ سر احمد پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

مقطع ہے ؎

مشرف کر مشرف کر خداوندا ؛ بھرا ہے شوق دل میں لطف کی انکی زیارت کا

دیوان لطف میں شامل "اشعار مناجات فقیر" اور "معراج نامہ" کے مصنف کافی ہیں۔ جیسا کہ مندرج اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے "شمس متضمن بر حال معراج آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تصنیف مولوی کفایت علی صاحب تخلص کافی۔" اور "خمسہ مولوی امداد اللہ صاحب تخلص امداد" کے تحت، امداد صاحب کی تخلیق شامل ہے۔ اور "غزل در لغت از شیخ حاجی مولوی محمد سعید مقتبس از مضامین آیات و احادیث" کے تحت، "غزل نعتیہ" بھی شامل ہے۔

۱؎ ارباب نثر اردو ص ۱۲۱ ۲؎ تذکرہ گلشن ہند مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق ص ۳

۳؎ تذکرہ گلشن ہند۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق ص ۴

مولوی عبد المجید ...

مولوی عبدالحمید حمید، مصطفےٰ حیدر، قاضی حمید الدین حمید، منشی حیدر علی حیدر، منشی عبدالسبحان شاکر منشی محمد اسمٰعیل خاں شوکت، عبدالعزیز عزیز، سید انجم حسین نادر، میر وزیر علی ناقی، خواجہ محمد بیدار بخت بیدار، حکیم حبیب الرحمٰن احسن، محمود الرب صدیقی خالد، مولانا عبدالکریم کے بعد آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ **اس دور کے شعرائے کرام** محی الدین احمد ابوالکلام آزاد، سید رضا علی وحشت، حکیم سید ابوالعلا سید احمد ناطق لکھنوی، آغا محمد شاہ حشر، وجاہت حسین عندلیب شادانی، کیفی چڑیا کوٹی، مولانا تمنا عمادی پھلواروی اثر ردولوی، سید ابوالفتح محمد شرف الدین شرق، سید محمد محمود، اکمل علی اکمل، حبیب النبی خاں صولت، عزیز النبی خاں عزیز، محمد سرور خاں سرور، مرزا فقیر محمد، عبدالمقتدر، نذرالاسلام، عبدالکریم نشتر، بدر الزماں بدر، سید کاظم علی کاظم جمیل مظہری، عبدالرحمٰن آصف، محمد سلیمان واصف، عبدالصمد قمر، فضل احمد کریم فضلی، عباس علی خاں بیخود، اکرام حسین پرویز شاہدی، سید امیر رضا مظہری الکاظمی، منشی مسیح الدین تمنا، محمد اسمٰعیل ذبیح، عطاء الرحمٰن صدیقی، ظفر ہاشمی، سید محمود طرزی، پروفیسر عبدالقیوم حسرت، سید محمد طاہر رضوی وحید النبی خاں وحید، امیر الاسلام امیر، اختر حسین اختر، پروفیسر عبدالرحیم، طاہر علی شاکر، ایم۔وائی۔ اختر، حافظ نظیر الحق مختار، محمد حنیف اسلم، غلام محمد مست، غلام رسول انجم، خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری، محی الدین محمود احمد، محمد محفوظ الحق، سلیم اللہ فہمی، آرزو سہارنپوری ابراہیم ہوش، محمد یونس احمر، احسن احمد اشک، ظہیر عالم صدیقی افسر، ابوالفضل کلیم اللہ، محمد حنیف، حکیم لقمان علی زار، حکیم عبداللطیف، سید ممتاز حسین طور سہسرامی، سید نظیر حسین نظیر، حسن نجمی سکندر پوری، عبداللہ ذاکر، عطاء الرحمٰن عطا، رشید الزماں خلش، عبدالمعبود عابد، ظہور الحق مبارکی، شمس عظیم آبادی، سید شاہ تاباں جمالی القادری، علی اختر، وفا راشدی، رشید احمد خاں شاد خضر پوری، ظہیر الدین محمد یحییٰ اظہر قادری، سید شاہ رشید الرحمٰن ارشد، عبدالرزاق صادق، غلام قدوس صدیقی قدوس، نظیر صدیقی نظیر، حفیظ رزاقی، راشد القادری، اقبال حسین اقبال، ناظر الحسینی، ساجن پردیسی، سحر کلکتوی، غلام مرتضےٰ قدسی، یاور حسینی، مضطر حیدری، نشاط القادری، محمد قاسم صبر خضر پوری، روشن علی حسرت۔ ادیب خضر پوری

احسان....


ابوالکلام آزاد
نواب عبداللطیف
ناوک
عزیز
نواب دہلوی
Rahi



میر امن
عابد ضمیر
بیخود
قمر صدیقی
آغا حشر
مضطر عظیم آبادی
مضطر حیدری
ساحل
نازش



واجد علی شاہ اختر

احسانؔ دربھنگوی، غلام رسول عشرؔ انصاری، جاویدؔ نہال، قیصرؔ نشاط، اشتیاق احمد، سہیل ادیبؔ، رضی ناطقؔ، عابدیؔ فیض آبادی۔

بنگال میں واجد علی شاہ اختر کا دور، اردو شاعری کے لئے زریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے شعرا یعنی شہ

اختر کے ہمعصر شعراء میر سادات حسین آغا جو شرفؔ، میر دوست علی خلیلؔ، سید مظفر علی خاں اسیرؔ، فتح الدولہ برقؔ، بہتاب الدولہ درخشاںؔ، علی حیدر نظم طباطبائیؔ، شیخ الٰہی بخش تبسم، گلشن الدولہ بہارؔ، منشی عبدالکریم ابدؔ، قاضی محمد اخترؔ، عبدالغفور خاں نساخؔ، حاجی عبدالحمید حمیدؔ، عبدالغفور شہبازؔ، عبدالودود، عبدالسبحان شاکرؔ، محمد اسمٰعیل شوکتؔ، عبدالعزیز عزیزؔ، میر وزیر علی، اعظمؔ (کلکتہ) معراجؔ (کلکتہ) خواجہ محمد افضل، نواب سید محمود آزادؔ، سید محمد آزادؔ (نامہ نگار اودھ پنچ) اکرام احمد ضیغمؔ، غلام خاں تمکیںؔ، خواجہ حیدر جہاں شائقؔ، خواجہ عبدالغفار اخترؔ، خواجہ عبدالرحیم صباؔ، شاہ رؤف احمد، راحتؔ سرہندی (ڈھاکہ) الفت حسین فریاد (مرشد آباد) ماشاءاللہ مصدر ________ جرأتؔ (مرشد آباد) حیدر بخش حیدریؔ، رمزؔ (چاٹگام) شاہدؔ (فرید پور) منظومؔ (مالدہ) انسخؔ (پنڈوا) فداؔ (سلہٹ) نجم الدین نادرؔ (میمن سنگھ) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

قلمکار خواتین نے بھی زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

قلمکار خواتین خجستہ اخترؔ، شائستہ اخترؔ، صحیفہ بانو، راحت آرا بیگم، حسن زہرہ بیگم شادانی، زینب نعمان تسنیمؔ، جمیلہ بیگم، محمود بیگم، عائشہ خاتون انجمؔ صغریٰ بیگم، صالحہ بیگم مخفیؔ، نجمہ بیگم مرادؔ، سوزاں بیگم سوزاںؔ، سرو ناز شیریںؔ، سیدہ بیگم محجوبؔ، قہر تمکیںؔ، بیگم صوفیہ کمالؔ، شہناز عذراؔ، بیگم حجاب، زہرہ بیگم حیاؔ، شمس النساء مخمورؔ،



بی بی ملکہ جان ملکہ

جمیلہ خاتون قمر، فصیح النساء فصیح، سیدہ خاتون اختر، عائشہ خاتون اختر، بیگم بلقیس سلیمانی، سارا پری مسیحو، سماہ جعفری، منی بائی حجاب، نواب بیگم، نوروز جہاں حور، مہ جبیں خمار، خورشید جہاں خورشید، رضیہ بیگم راحت، رعنا علی راز، رئیسی بیگم، منی جان زہرہ، بگن زیب، محمدی جان شباب، شرف النساء، نازنین بیگم شکستہ، شرم، مولا جان شوخ، شیریں شوخ، شیریں جان شیریں، فہیمن صنم، عالم، نواب عشرت محل، عصمت، لطیف بی بی فاطمہ، بیگم ماہ طلعت قمر، بی بی محمدی جان لطیف، محبوب محل، امامی جان محبوب، بی صالح معشوق، بی بی ملکہ، اینی بلوچر (ANNE BLOCHER) اچھی بی ناز، نازاں، حمیدن بائی نقاب، گوہر جان ہمدم۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں مسلمانوں کے ساتھ، ہندو فنکاروں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے بنگال میں بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات مستحسن ہیں۔ ہندو فنکاروں کے نام ہیں نہال چند لاہوری، بینی نارائن جہاں، سری لال گجراتی۔ لالہ سدا سکھ لال، ہری ہر دت، ہیم چندر، راجہ کرشنا دیب، راجہ موہن رائے، شیب چندر کرمکار، راج کرشنا، راجہ اپروپ کالی کرشنا کنور، راجہ جاذب کرشنا دیب شفق، بابو کرشنا چندر گھوش کش، راجہ جنجوئی مترا ارمان، جگن پرشاد ملک، راجہ جنم جے مترا، ہردی رام جودت، لالہ کھیم نرائن رند، راؤ کانت، جوالا ناتھ آگہہ، جھبو لال طرب، متھرا داس، دیبی پرشاد دل، بینی بہادر راجہ، رام نارائن موزوں، منی لال جوان سندیلوی۔

۱۹۴۷ء کے بعد کا دور

آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو کے مزاج نے ایک نیا اور اہم موڑ لیا۔ نئی تبدیلی نے ماضی کی دین، رجعت پسند ادب کے تابوت میں، آخری کیل ٹھونک دی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسند ادب کی خوشگوار لہریں ہر طرف پھیل گئیں، جدیدیت بھی، ایک شاخ کی شکل میں ابھری ——— نئے چہرے اور قابل قدر شاعر

ادیب....



علامہ رضا علی وحشت

ادیب، جو پس منظر میں تھے۔ انہیں سامنے آنے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ ساتھ ہی یہ جذبہ بھی ابھرا کہ صرف اردو شاعری کے زلف و گیسو کے رسیا رہنے کے بجائے، نثر کی کٹھن راہوں کو بھی اپنایا جائے۔ اس طرح گلشن نثر کا وہ درخت، جس کی آبیاری فورٹ ولیم کالج نے کی تھی۔ اور جو سوکھنے لگا تھا۔ نئی تروتازگی پاکر، اس میں نئی کونپلیں پھوٹیں اور نثر کا دامن بھی، گہر نایاب سے پُر ہونے لگا۔

مغربی بنگال میں اردو شعر و ادب کا مطالعہ کرتے وقت، اس کے تین خاص پہلوؤں کو ذہن میں رکھنا، ازحد ضروری ہے۔ کیوں کہ ان پہلوؤں سے واقفیت حاصل کئے بغیر اس کے صحیح مزاج سے ہمیں آگہی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ تینوں زنجیر کی کڑیوں کی طرح، ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہیں۔

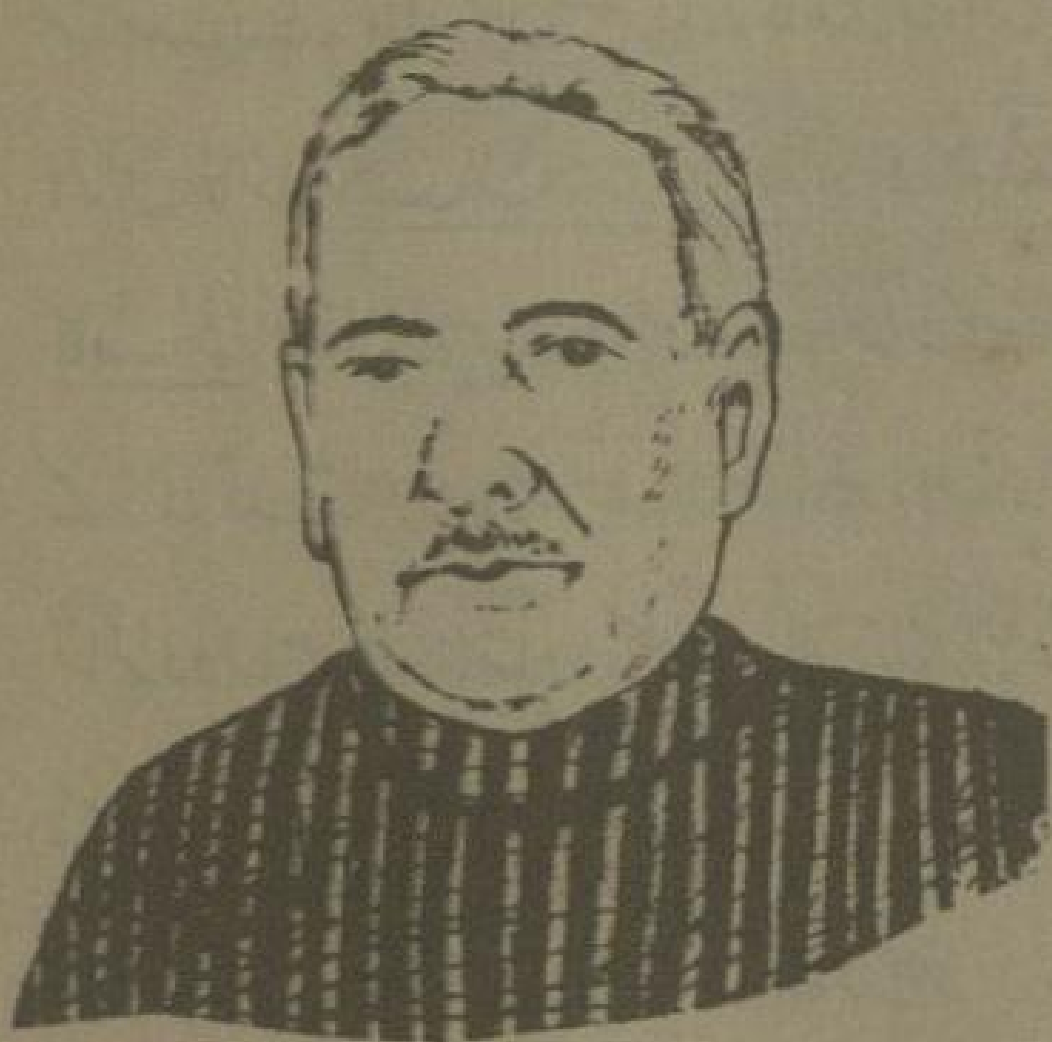
۱۔ کلاسیکی ادب۔ ۲۔ ترقی پسند ادب۔ ۳۔ جدید ادب۔

دورِ جدید میں گرچہ کلاسیکی شاعری کی اہمیت کو ترقی پسند لہروں نے کسی حد تک ختم کردیا ہے۔ لیکن بنگال میں کلاسیکی شعراء، خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور یہاں کے شعری ادب میں خاص عضو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری نے یہاں عروج کا زمانہ دیکھا ہے ـــــــ اب جدیدیت کی لہریں، اس کے مقابل میں ہیں۔ یہ نئی لہریں بھی، یہاں کے نثری و شعری ادب پر اثر انداز ہو رہی ہیں، کلاسیکی شاعری کی تاریخ میں ناسخ سے وحشتؔ تک کا زمانہ، سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں، اردو شاعری نے بنگال میں، کئی اہم موڑ لئے۔ اس کے مزاج میں ہونے والی تبدیلی نے، خوبصورت نقش و نگار بنائے اور پھر "دبستان وحشتؔ" مثل چراغ کے روشن ہوا۔ جس کے سائے میں، اردو شاعری کا قافلہ منزل کی جانب رواں ہوا۔ اور ترقی کا یہ سفر، ہنوز جاری ہے۔ نئے اور پرانے چہرے "دبستان وحشتؔ" کی دلفریبی و جاذبیت بڑھا رہے ہیں۔ اس کی عظمت میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔

علامہ رضا علی وحشتؔ....

علامہ رضا علی وحشت

علامہ وحشت کا شمار، ہندوستان کے قابل قدر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ علامہ نے بنگال میں اردو شاعری کو فروغ دیا ہے اپنے خون جگر سے اردو شعری چراغ کو روشن رکھا "دیوان وحشت" اور "ترانۂ وحشت" کا مطالعہ وحشت کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے —— وحشت کی شاعری کا رنگ، غالب کے انداز فکر سے مستعار تھا۔ اس خیال کو "تتبع غالب" نے تقویت بخشی۔ مگر اہل نظر اس



علامہ جمیل مظہری

بات سے کماحقہ، آگاہ ہیں کہ وحشت نے "تتبع غالب" تک، خود کو محدود نہیں کیا۔ بلکہ غالب کے اثر سے الگ ہو کر بھی، شاعری کی ہے۔ اور وحشت کی شاعری کا یہ حصہ، ان کے خاص انداز فکر و طرز ادا کا مظہر ہے۔ ان کے مخصوص رنگ میں ڈوبی ہوئی شاعری ہی، وحشت کو "علامہ وحشت" بناتی ہے۔ علامہ وحشت کے دو عزیز شاگرد، جو بعد میں جانشیں بھی ہوئے۔ اور "دبستان وحشت" کو وسعت دینے میں انہوں نے اہم کردار بھی ادا کیا ہے۔ وہ ہیں حضرت طاہر علی شاکر اور حضرت عبدالرحمٰن آصف۔ لیکن وحشت کو بحیثیت استاد شاعر، بلند مرتبہ دینے والوں میں علامہ جمیل مظہری، حضرت عباس علی خاں بیخود مرحوم اور حضرت ابراہیم ہوش کے نام سر فہرست ہیں۔

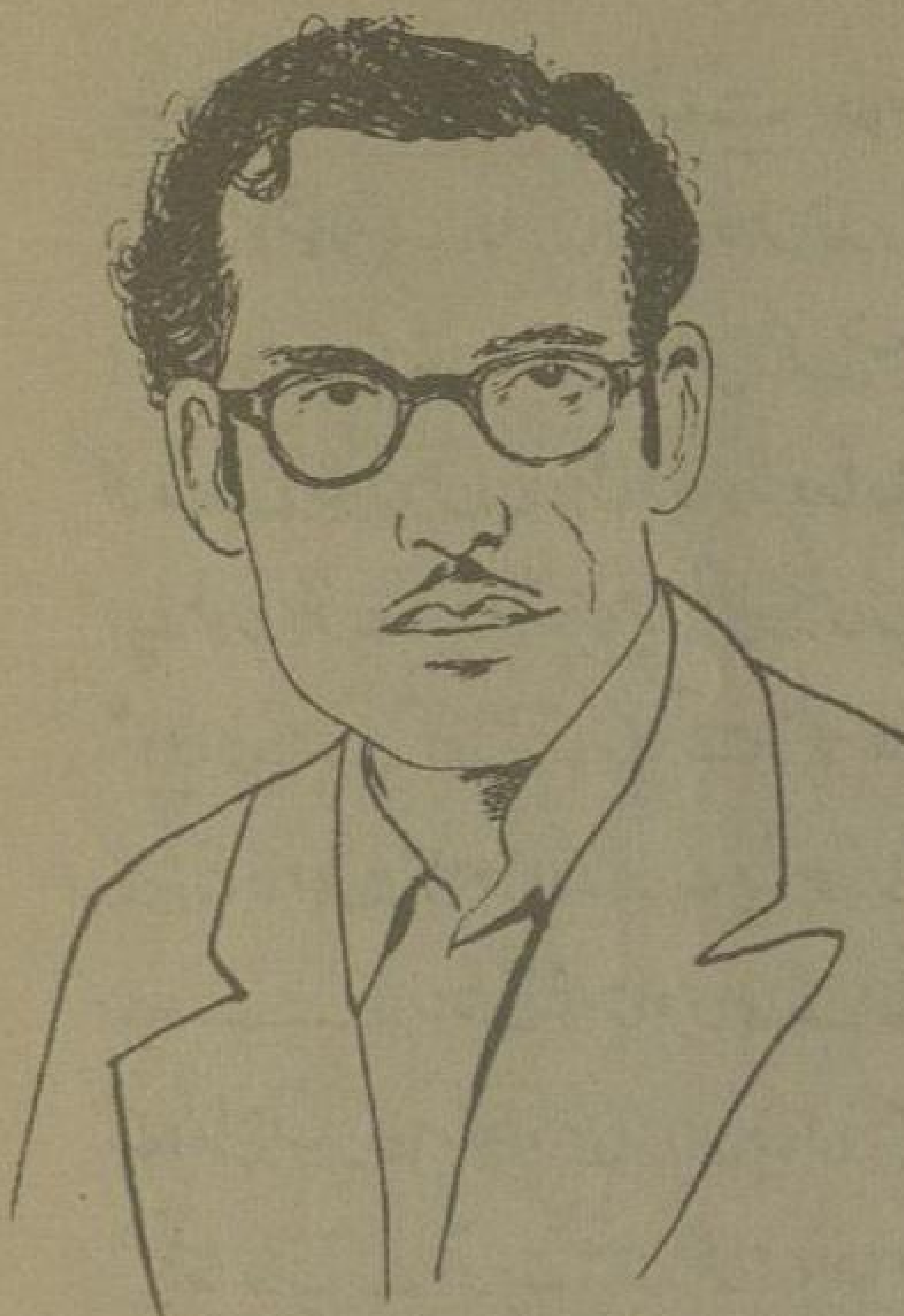
جمیل مظہری

علامہ جمیل مظہری کا بنگال سے گہرا ادبی رشتہ رہا ہے۔ اور اب پھر ہو گیا ہے۔ ان کی شاعری کے خدوخال کو ابھارنے میں بنگال کا حصہ، صوبہ بہار سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ علامہ مظہری کا یہ شعر، اردو کے عظیم شعرا کے منتخب اشعار کی مختصر سے مختصر فہرست میں بھی، نمایاں جگہ پانے کا مستحق ٹھہرے گا ؂

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا ؎ اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

جمیل مظہری کا شمار، اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے "نقش جمیل" (۱۹۵۳ء) فکر جمیل (۱۹۵۸ء) عرفان جمیل (۱۹۶۹ء) آب و سراب (۱۹۷۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ناولٹ "شکست و فتح" "(فرض کی

قربان گاہ ...



احسان دربھنگوی

قربان گاہ پر) بھی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا جس کو راقم الحروف کی نظر میں ، طویل افسانہ - کہنا ، زیادہ مناسب ہے - علامہ جمیل مظہری کے تلامذہ میں ، احسان الرحمٰن خاں احسان دربھنگوی اور فریدہ کاشانی کو خاص اہمیت حاصل ہے - احسان کا بنگال کے ذی قدر شاعروں میں شمار ہوتا ہے - احسان کے شاگردوں میں ظہیر ناشاد دربھنگوی اور تابش عظیم آبادی کے نام نمایاں ہیں - ؎

وقت رخصت نہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھو
اک مجاہد کو مجاہد کی نظر سے دیکھو

فریدہ کاشانی کا شعر ہے ؎

نظر آیا جہاں بھی نقش پا صحرا نوردوں کا ÷ فریدہ نے ادب سے اپنی پیشانی وہاں رکھدی

ابراہیم ہوش[1] ابراہیم ہوش کا شاعرانہ سفر ، کبھی جمود کا شکار نہیں رہا - ان کے سیاسی مقاصد کے ساتھ مسلک و مقصد شاعری میں بھی ، تبدیلی ہوتی رہی ہے - کلاسیکی شاعر کی حیثیت سے ، وہ اردو شعری دنیا میں نمودار ہوئے - اور بحیثیت ترقی پسند شاعر ، شہرت حاصل کی - اور اب جدید لہجے کو اپنا چکے ہیں - وہ شاعر ہیں لیڈر نہیں - یہی وہ اصول ہے ، جس نے ان کی شاعری کو بھرپور زندگی دی ہے - ہوش کی یہ تحریر (جو میرے پاس محفوظ ہے) میرے الفاظ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت ہے :-

" ۱۹۴۴ء میں روزانہ اقبال (بمبئی) اور ہفتہ وار نظام (بمبئی) کا ایڈیٹر تھا - اس وقت میں نے ترقی پسند ادیبوں کے خلاف ، انکی عریاں اور فحش نویسی کے خلاف ، زبردست تحریک چلائی تھی - جس میں بمبئی کے تقریباً سبھی اخبارات ، ہفتہ وار رسائل ملوث ہوگئے - ماہر القادری ، نخشب جارچوروی ، آرزو لکھنوی اور اس قسم کے

---

[1] ابراہیم ہوش ، آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے ، بعد میں وحشت کلکتوی سے وابستہ ہوئے -

بہت سے .....

بہت سے لوگ، میرے ہمنوا تھے۔ اسی دوران میں، سجاد ظہیر اور کیفی اعظمی سے ملاقات ہوئی۔ کیفی اعظمی میرے دفتر میں روزانہ آتے اور گھنٹوں رہتے۔ کمیونسٹ تحریک کے سلسلے میں، بہت سی کتابیں انہوں نے مجھے دیں۔ جس میں سب سے زیادہ متاثر، بالشویک پارٹی کی تاریخ نے کیا۔ تب سے میں آج تک مارکسزم کا حامی ہوں۔



ابراہیم ہوش

ترقی پسند تحریک کا حامی بن گیا اور آج بھی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی پارٹی سے وابستگی نہیں رکھی۔"

ہوش کی شاعری نے زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ اور رفتار زمانہ کے ساتھ، ان کی شاعری میں تیکھا پن بھی آیا ہے۔ ان کے نظریۂ شاعری کے متعلق، اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ وہ ترقی پسند نظریئے کو مطمح نظر بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر میں یہی وہ ادب ہے، جس نے انسان کو حقیقت بیں نظر، سوچنے اور سمجھنے کا سلیقہ اور خیال کو برتنے کا صحیح انداز دیا ہے۔ اور یہ احساس بھی کہ وہ ادب جو تفریح کے دائرے میں محبوس ہو اور جس میں انسانی ذہن کا تجزیہ کرنے، ماحول پر گہری نظر رکھنے اور تبصرہ کرنے، زندگی کے الجھے تاروں کو سلجھانے میں مدد دینے کی صلاحیت نہ ہو، وہ صحیح معنوں میں ادب کہلانے کا مستحق نہیں۔

ابراہیم ہوش کی شاعری کو دو ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) پہلا دور ابتدا سے سنہ ۶۰ء تک (۲) دوسرا دور سنہ ۷۰ء تا حال ——— ہوش نے سنہ ۶۰ء تا سنہ ۷۰ء، ایک شاعر کی حیثیت سے گمنامی کی زندگی گزاری اور اس دس سال کی طویل خاموشی پر طنز کرتے ہوئے، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب "اردو اور بنگال" میں لکھا ہے "پہلے واقعی شاعر تھے۔ لیکن اب شاعری پر صحافت مکمل طور پر غالب آچکی ہے اور صرف شاعر کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے ضرورت کے تحت کبھی کبھی چند اشعار کہہ لیا کرتے ہیں۔" پھر وہ

دن بھی .....

دن بھی آیا، جب مولانا آزاد کالج کلکتہ کے تاریخ مشاعرہ سنہ ۸۲ء نے ہوشؔ کی اس طویل خاموشی کو توڑ دیا اور ایک بار پھر، انکی زندگی سے بھرپور اور خیال آفریں، گنگناتی ہوئی آواز نے ابھر کر، انکی شاعرانہ خوبیوں کا سب کو احساس دلا یا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہوشؔ کی خاموش پسند طبیعت نے وقتی طور پر ان کی ادبی خدمات کو ہڑپ کر لیا تھا۔ مگر ان کی مستقل مزاجی اور شعور و ادب کی ہم آہنگی نے ان کو وہ مقام دیدیا۔ جس کی تمنا ہر شاعر و ادیب کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اس خوددار شاعر



شاکرؔ کلکتوی

کی خوداعتمادی اور بے پناہ صلاحیت نے سب کو اپنے فن کا معترف بنالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

چلا ہے وقت نے تعمیر فردا کیلئے ہم کو ؛ قدم آگے بڑھا اے زندگی اب سوچنا کیا ہے

ہوشؔ، منجھے ہوئے غزل گو ہیں۔ اپنے خیال کو پرکشش اور جاذب نظر لباس دینے میں وہ مہارت رکھتے ہیں۔ الفاظ کی ترتیب اور ان کا آہنگ دلپذیر ہے۔ ایک شعر ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ جو انہوں نے تقریباً بیسؔ سال قبل کہا تھا ؎

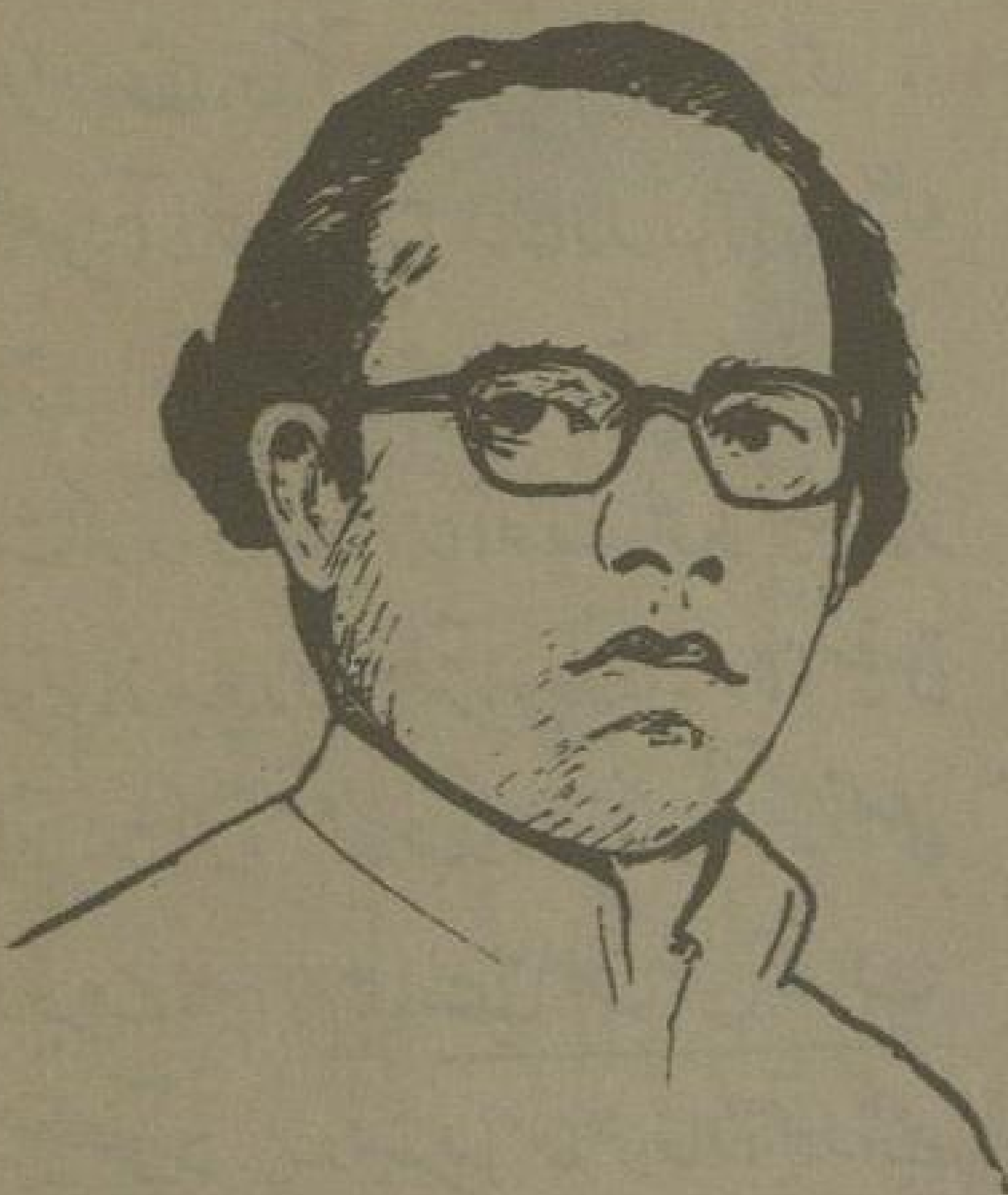
تو اپنے جلوہ ہائے خاص کو کیوں عام کرتا ہے ؛ یہ ارزانی مرے دل کو گراں معلوم ہوتی ہے

جبکہ ہوشؔ، اب یہ کہتے ہیں ؎

دعوت جوان کو رات نے دی چاندنی کے ہاتھ ؛ کپڑے بدل کے سارے نقیب سحر گئے

ابراہیم ہوشؔ کی متنوع شخصیت، صرف شاعری تک محدود نہیں۔ وہ اردو صحافت میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ شاکرؔ کلکتوی شاکرؔ مرحوم، علامہ وحشتؔ کے شاگرد اور جانشین بھی تھے۔ شاکر نے وحشتؔ کے رنگ شاعری کو پھیلایا اور دبستانِ وحشتؔ کی حفاظت کی۔ اور بزم شاکری کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کے شعری مجموعے "پریخانۂ الفت"۔ اور "شاہکار قصید" شائع ہو چکے ہیں۔ جو ان کی شاعری کو سمجھنے میں، معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

شاکر صاحب ...



ناظم سلطانپوری

شاکر صاحب کے بعد بزم شاکری کی کچی دیوار، میں شگاف پڑ گیا۔ اس کمزور لمحہ میں، شاکر مرحوم کے عزیز ترین شاگرد حضرت ناظم سلطانپوری سامنے آئے۔ اور انہوں نے اس گرتی ہوئی عمارت کو ملبا کا ڈھیر بننے سے بچایا۔ **ناظم سلطانپوری** شاکر، آصف، ہوش اور منظری کے بعد، "دبستان وحشت" کے لئے "مضبوط ستون" بنے، ایک مضبوط کڑی کی شکل میں ابھر کے سامنے آئے۔ وہ شاعری میں "پیری مریدی" کے قائل نہیں۔ انہوں نے بھی علامہ منظری اور حضرت ہوش کی طرح، اپنے اسلوب اور انداز فکر کو "تقلید" کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ بلکہ اپنے لئے ایک نئی راہ، نیائی اور انفرادیت کی تلاش میں، کامیاب بھی ہوئے ؎

کیوں پئے راہ مہ و خور سے اجالا مانگوں ؛ ان چراغوں سے میرا داغ جگر کم تو نہیں

نسیم سلطانپوری، نور کلکتوی، حشم الرمضان، سجاد شاکری، غلام حسین ایاز اور عاشق فیض آبادی شاکر مرحوم کے اچھے شاگردوں میں ہیں۔ **عاشق** خضر پور کے ممتاز شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو، جس میں شاعر نے اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے ؎

یہ کہاں کی پردہ داری ہے بتا پردہ نشیں ؛ دل سے کچھ پردہ نہیں اور آنکھ سے پردہ رہا

ان کے علاوہ شاگردان شاکر میں، یہ نام بھی اہم ہیں:۔ موج شاکری، ارمان شام نگری، صادق گیاوی، شاہد جمیل، انجم عظیم آبادی، قیصر سلطان پوری، اشرف جہانگیری، مختار غازیپوری۔

آصف بنارسی حضرت عبدالرحمٰن آصف حضرت وحشت کے شاگرد اور جانشین ہیں۔ اپنے رنگ میں اچھا کہتے ہیں ؎

غم کی طرح خوشی کا تعلق بھی جی سے ہے ؛ دل مبتلائے غم ہے تو اپنی خوشی سے ہے

ان کے شاگردوں میں پروفیسر اختر، اختر پشاوری، افضل ایم۔ اے، ڈاکٹر شیدا دہلوی، پردیسی

چکوالی ....



قیصر شمیم

چکوالی، ساغر جنیوٹی، شفقت کلکتوی، عطاء الرحمٰن عطا، قدوس صدیقی، کلیم جونپوری، لچھمن نارائن، سوچ مدن لال آبادی، مایا علی درد، بسمل، جین چینی، عارف، کاشف، شاکر ذاکر، رضا ابن آصف، محمد اسمٰعیل فائز عزم بازید پوری، اختر ماہ پوری، مولانا شفیق اطہر، شاکر آصفی، عبداللہ ذاکر، فائز آصفی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ **عباس علی خاں بیخود** پروفیسر عباس علی خاں بیخود اچھے شاعر اور قابل قدر استاد تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "جام بیخودی" شائع ہو چکا ہے۔ وحشت کے عزیز شاگردوں میں، ان کا شمار ہوتا ہے ۔

چھیڑ کر پوچھو نہ دیوانے سے دیوانے کا حال ؛ جو نہ کہنا چاہیے وہ بھی بیاں ہو جائے گا

ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ چند اہم نام یہ ہیں۔ **قیصر شمیم** عبدالقیوم خاں نام ہے۔ عمید انگسی کے نام سے، بہت دنوں تک لکھتے رہے۔ پھر قیصر شمیم کے نام سے لکھنا شروع کیا ـــــ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے، ابتدا میں ابھر کے سامنے آئے۔ اچھے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ گیت نگار اور نظم گو شاعر کی حیثیت سے وہ بنگال میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ "ساعتوں کا سمندر" قیصر شمیم کا شعری مجموعہ ہے۔ مگر وہ قیصر کی شاعری کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ جدید شاعر کی حیثیت سے بھی انہوں نے مقام بنایا ہے۔ اور بنگال کے ممتاز جدید شاعروں میں، ان کا شمار ہوتا ہے ۔

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصر ؛ کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

قیصر شمیم کے شاگردوں میں خالق عبداللہ، مطرب بلیاوی، نور پیکر، حشمت فتح پوری، نور بھارتی رستم کلیانوری، مختار احمد مسافر، سید الابرار وغیرہم، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **رونق نعیم** محمد ابوالقاسم، رونق نعیم، ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے، اردو شعری دنیا میں نمودار ہوئے، اب جدید ہو گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "دائرہ در دائرہ" ان کے نامکمل "جدید ادبی پیکر"

کی عکاسی کرتا ہے۔ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اردو شعری ادب کو جو کچھ دیا ہے، وہ قابل قدر ہے، نظم گو ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے ادبی وجود کو نظم "کالے ہیکر" نے دوامی زندگی بخش دی ہے۔ بحیثیت جدید شاعر، ان کا جو بھی قد ہے، وہ فی الوقت نظروں سے اوجھل ہے۔



وکیل اختر

پروفیسر عبد الرؤف بخود مرحوم کے عزیز ترین شاگردوں میں ہیں۔ نظم کے شاعر ہیں غزل بھی کہتے ہیں۔ آزادی کے بعد منظوم ترجمہ نگاروں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **حفیظ رزاقی** اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان کے بارے میں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک اچھا شاعر، خاموشی کی نذر ہو گیا ہے ؎

ہر موڑ پہ کھی یوں تو صداؤں کی نرم چھاؤں ؛ پھر بھی انا کی دھوپ میں کچھ لوگ جل گئے

وکیل اختر[1] وکیل اختر، اچھے ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے لہجے میں نئی تبدیلی خاص جگہ بنا رہی تھی کہ موت کے خونی پنجے کا شکار ہو گئے۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی ؛ عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

اسد الزماں اسد کم گو شاعر ہیں اور اپنے خول میں سمٹے رہنے کا روگ، ان کی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ جس کی وجہ سے، وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے، جس کے وہ حقدار تھے ؎

ساحل نشیں تھے جب تو ڈراتی تھی تند موج ؛ دریا میں ہم جو اترے تو دریا اتر گیا

---

[1] وکیل اختر کے متعلق، بعض احباب نے لکھا ہے کہ انہوں نے ازدواجی الجھنوں سے گھبرا کر، زندگی کے آخری ایام میں، دوسری شادی کی تھی، یہ خیال، صداقت پر مبنی نہیں۔ اختر مرحوم کے چھوٹے بھائی خلیل اختر، جو اچھے شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کی پر زور تردید و مذمت کی ہے۔ یوں بھی ایک حساس شاعر کا جو کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو، اس کا زندگی کے آخری لمحات میں شادی کرنا قرین قیاس نہیں

پروفیسر ...

پروفیسر مجیب الرحمن عدنی | پروفیسر عربی، فارسی زبان کے مشہور ادیب ہیں۔ اردو میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ ابتدا میں بیخود مرحوم سے اصلاح لیتے تھے ؎

عجب ادائے حسیں سے وہ رام کرتے ہیں
جھکی ہوئی ہے نظر اور کلام کرتے ہیں



پروفیسر مجیب الرحمن عدنی

رابعہ سلطانہ ناشاد | ناشاد، اچھی شاعرہ ہیں۔ "ناسور" اور "طوفان غم" ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ؎

میرے لئے شب ماہتاب اک قیامت ہے
تم آؤ چاند ستاروں میں دل نہیں لگتا

سعید قدرت | ترقی پسند شاعر تھے، اب جدید شاعر کہلانا پسند کرتے ہیں۔ غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہتے ہیں ؎

ہم دونوں تعمیر کے راہی راہ مگر دونوں کی الگ ؛ میں نے بنایا مٹی کا گھر تم نے بنایا تاج محل

شہزاد ہاشمی | بیخود مرحوم کے شاگردوں میں شہزاد ہاشمی بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں ؎

بڑا حسین تصور تھا موسم گل کا ؛ بہار آئی تو سارے چمن میں آگ لگی

ان کے علاوہ بھی، بیخود مرحوم کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں۔ **تاباں القادری** سید شاہ عنایت سوئی تاباں جالی القادری، بلند پایہ شاعر اور اچھے نثر نگار تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "شام روح" اور تذکرہ "جام نو" شائع ہو چکے ہیں ؎

کہہ گئی محفل میں ان سے مرے دل کی داستاں ؛ وہ نگاہ یاس جس کو بے زباں سمجھا تھا میں

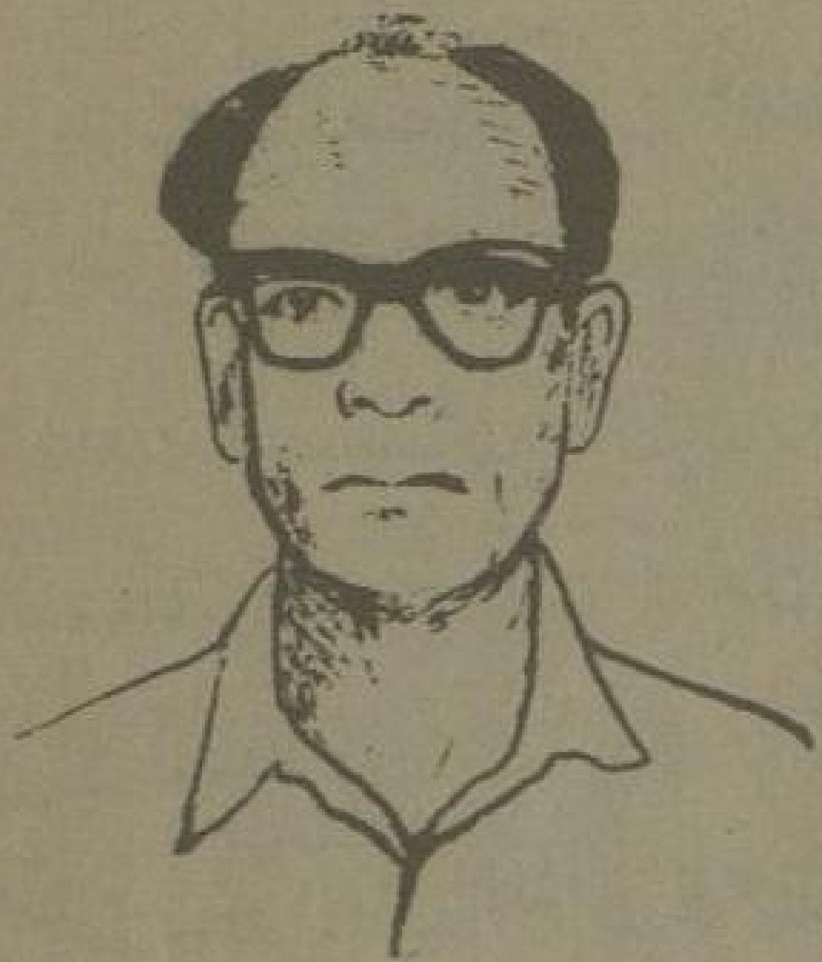
قمر صدیقی | کیپٹن قمر صدیقی، علامہ وحشت کے چہیتے شاگرد تھے۔ قمر کے متعلق وحشت کا شعر ہے ؎

قمر کے آنے سے محفل میں چار چاند لگے ؛ سخن قمر کے لئے ہے قمر سخن کے لئے

اور قمر صدیقی کا دعویٰ تھا ؎

کہاں نکتہ فہمی سے قمرؔ اپنا یہ دعویٰ ہے!!
کوئی وحشتؔ کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

قمرؔ صدیقی کی آغوش تربیت نے اظہرؔ قادری، فضلیؔ واثرؔ صدیقی کے ذہن کو سنوارا ہے ——



فخرالدین صدیقی اثرؔ

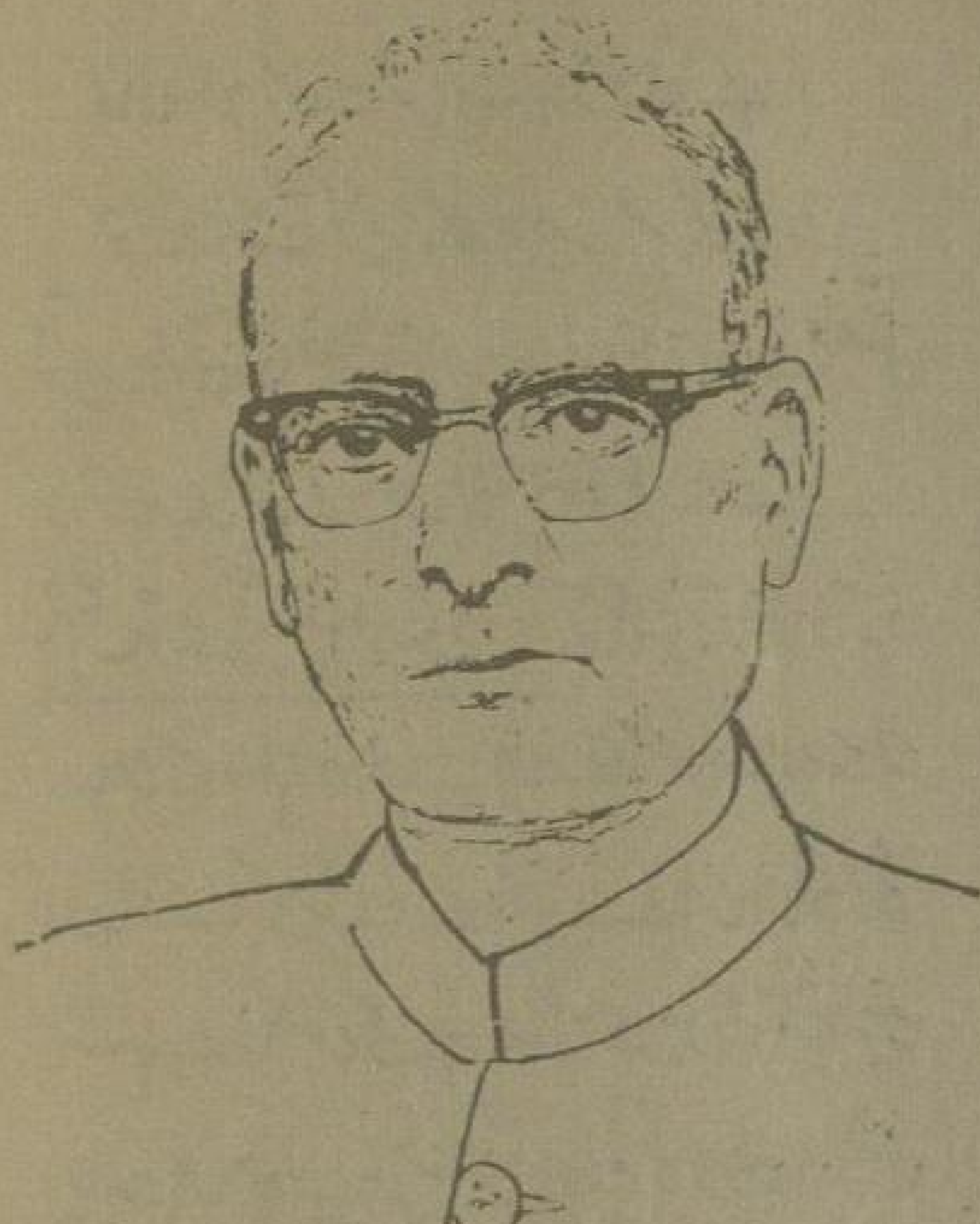
ڈاکٹر عطا کریم برقؔ ڈاکٹر برقؔ، فارسی زبان کے عالم اور ادیب ہیں۔ فارسی کے اسکالر اور ادیب کی حیثیت سے، آپ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ فارسی میں کئی کتابیں ایران میں چھپ کر قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ "تاثیر در زبان و ادبیات بنگالی" "احوال و آثار صفی علی شاہ" اور "مطالعہ ایں در نفیس علی شاہ" جیسی شاہکار کتابیں، انہوں نے فارسی ادب کو دی ہیں۔ لہٰذا اس میں شک کی مطلق گنجائش نہیں کہ برقؔ صاحب فارسی کے ادیب و شاعر ہیں۔ لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز، اردو شاعر و ادیب کی حیثیت سے ہوا کئی گرانقدر مضامین، انہوں نے اردو ادب کو دیئے ہیں، جن میں پروفیسر کلیم الدین کی شخصیت پر ان کا مقالہ، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ متعدد اردو کتابوں کے انہوں نے دیباچے لکھے ہیں اور یونیورسٹی کے کئی ریسرچ اسکالر، ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

کیوں برقؔ مبتلائے غم بے سبب رہیں ؏ مشکل کو اپنی آپ ہی آساں کریں گے ہم

فخرالدین صدیقی اثرؔ پروفیسر صدیقی بھی علامہ وحشتؔ کے شاگرد تھے۔ فضلیؔ اور قمرؔ صدیقی کے، چھوٹے بھائی ہیں۔ لہٰذا بچپن ہی سے شاعرانہ ماحول ملا۔ اور آپ نے شاعرانہ مزاج بھی پایا ہے۔ کم کہتے ہیں، لیکن خوب کہتے ہیں ؎

سخن کا حق ادا کرنے لگی ہے خامشی میری ؏ خدا کا شکر ہے اب وہ زبانِ بے زباں سمجھے

حضرت وحشتؔ کے شاگردوں میں مرزا جعفر کشفیؔ، عبدالقیوم حسرتؔ نعمانی، اختر حسین اخترؔ، سید محمود طرزیؔ، قربان علی بقریؔ، حافظ اسلم فطرتؔ، واقفؔ بہاری، ابوالمکارم سلیم اللہ فہمیؔ، بیدلؔ عظیم آبادی ....



جرم محمد آبادی

عظیم آبادی، محمد سلیمان واصف وغیرہم بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

علامہ وحشت کے بعد آرزو لکھنوی اور ناطق لکھنوی کی استادانہ حیثیت مسلم ہے۔ ان دو اساتذہ نے بھی، بنگال میں اردو شعر و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں آرزو کے تلامذہ میں جرم محمد آبادی، نواب، پرتو لکھنوی، اور ناوک لکھنوی، خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جرم محمد آبادی بنگال کی اردو شاعری میں جرم کی خدمات مستحسن ہیں۔ زندگی کا طویل عرصہ، انہوں نے شعر و ادب کی خدمت میں، صرف کیا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "تیر نظر" اور "شعلہ رنگیں" شائع ہو چکے ہیں ؎

عیش حیات خاک ہے، جب غم عشق ہی نہیں ؛ دل کے بجھے چراغ میں تیل ہے روشنی نہیں

جرم کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے، چند کے نام ہیں۔ شہادت حسین نازش سکندرپوری، عبدالحق سوز سکندرپوری، ثمر خضرپوری، ولی صدیقی سلطانپوری، ضرب لکھنوی، اظہر اورنگ آبادی ریاض غازی پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نازش | جرم کے شاگردوں میں نازش سکندرپوری کا مرتبہ بلند ہے اور ان کا شمار اچھے استادوں میں ہوتا ہے ؎

شکست دل سے دنیا آشنائے راز ہوتی ہے ؛ ادھر شیشہ کھنکتا ہے، ادھر آواز ہوتی ہے

ناوک لکھنوی سید ناوک لکھنوی، آرزو کے شاگردوں میں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

مصیبت اپنی تماشہ ہے اہل گلشن کو ؛ کوئی بجھاتا نہیں آگ آشیانے کی

نواب دہلوی نواب کا بنگال کے اساتذہ میں شمار ہوتا ہے ؎

یہاں تک حسن کے جلووں سے دل معمور ہو جائے ؛ کرن جو پھوٹ کر نکلے چراغ طور ہو جائے

ان کے شاگردوں میں مضطر لکھنوی، حفیظ گیاوی، دلی دہلوی، کنول سیالکوٹی، راشد صدیقی،

شباب گجراتی ...



شباب گجراتی، تابش دہلوی، حاصل یوسفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

آرزو کے تلامذہ میں شہنشاہ حسین ارتم سراج احمد سراج، کلیم فیض آبادی، منی لال جوان، مطیع الرحمٰن لائق، ابراہیم ہوش، انجم کلکتوی طور سہسرامی کے نام بھی اہم ہیں۔

سید ابوالعلا سید احمد **ناطق لکھنوی** نے بھی، بنگال کے اردو ادب پر گہرا نقش مرتب کیا ہے۔ رضی ناطقی اور پیام ناطقی ان کے دو عزیز شاگرد ہیں۔ **رضی ناطقی**

ڈاکٹر رضی ناطقی، شاعر، ناقد اور شعلہ بیان مقرر ہیں۔ انہوں نے ادبا و شعرائے کلکتہ پر قطعات کہے ہیں، وہ ان کی استادانہ صلاحیت کا مظہر ہے ؎

دونوں ہوئے یک جا اب ایک ہی بچا ہے ؎ یا ہے سرِ عقیدت یا ان کا نقشِ پا ہے

ثمر خضر پوری، کوثر فیض آبادی، وفا شیر نیادی، حسرت کانپوری، جمال کاشی پوری، فرحت مظفر پوری شعلہ کاشی پوری، نشتر کاشی پوری باضابطہ شاگرد ہیں۔ انجم باروی اور مفاضل الحق مہری رامپوری بھی مشورہ سخن کرتے ہیں۔ انجم باروی کا شعر ہے ؎

بولے طبیب ہیکر کیا ہے علاج غم کا ؎ ملتی ہے نبض لیکن دل ہے کہ ڈوبتا ہے

حافظ مہری۔ حافظ مفاضل الحق مہری رامپوری فارسی زبان کے اچھے شاعر ہیں۔ اردو میں بھی، خوب کہتے ہیں ؎

اس اک نگہ کے قرباں حل ہو گئے مسائل ؎ کب ہم نے کچھ کہا ہے کب اس نے کچھ سنا ہے

غواص قریشی مغربی بنگال کے اردو ادبی خدمت گزاروں میں، عبدالغفار غواص قریشی، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہوڑہ میں اردو کا ماحول بنانے اور ادبی فضا قائم کرنے میں، غواص نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول امداد افضل " اس خاموش محسن نے جس طرح ایک غریب اور مزدور علاقے کو فکر و فن ...



غواص قریشی

کو فکر و فن کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا ادبی کفر ہوگا۔" [1] اور سالک لکھنوی کی نظر میں "انہوں نے ہوڑہ کی اردو ادبی زندگی کو سنوارا اور پروان چڑھایا ہے۔"

پیام ملتا ہے پیغمبری نہیں ملتی
خدا تو ملتا ہے سب کو خودی نہیں ملتی

شاگردانِ غواص میں، یہ نام نمایاں ہیں ـــــ

عزیز غواصی | غواص قریشی کے شاگرد اور جانشیں ہیں ؎

کوئی تدبیر نو، اے اہلِ زنداں
کہیں زنجیر کٹتی ہے دعا سے

ان کے شاگردوں میں نور قریشی اور ع۔م۔ تم حمیدی، نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نور محمد نور قریشی "دبستان غواص" کے روشن چراغ ہیں، بقول ازکی غواصی "ہلکے پھلکے لفظوں میں بلیغ تر شعر کہتے ہیں"۔ ایک شعر درج ہے ؎

ضیا فروش نہ ہوتیں مسرتیں اتنی ⁂ جو دل کے شیشے میں تصویرِ غم نہیں ہوتی

ازکی غواصی | اصغر علی ازکی غواصی، اچھے شاعر ہیں ؎

روح بھی یہاں زخمی، دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے ⁂ دورِ آدمیت میں آدمی ہے آزردہ!

ان کے شاگردوں میں ابراہیم آتش، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اظہارِ محبت بھی جہاں جرم ہے یارو ⁂ ہم درسِ وفا آج وہاں لیکے چلے ہیں

حامی گورکھپوری | عبدالحئی حامی گورکھپوری، اچھے شاعر ہیں۔ اور قوالوں کی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ؎

---

[1] غواص قریشی کی شاعری۔ از ا۔ ا۔ ازآفضل۔ مطبوعہ "شخصیات نمبر" سبدگل (کلکتہ)

تیرگی دھوپ میں تحلیل ہوئی جاتی ہے
قافلہ شام کا پہونچا ہے سحر کے نزدیک



امیر رضا کاظمی

شوکت عزا آتی، ضیاء الدین ضیاؔ، رحیم رزؔمی، شمیمؔ غازی پوری، حبیب ہاشمی کا شمار، حالیؔ کے عزیز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ **عبد الرحیم برہمی** باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ اور اس کی جھلک، ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے ؎

تڑپ سیماب کی، بجلی کی شوخی، شمس کی حدت
کسی دن یہ سمٹ کر عاشقوں کا دل نہ بن جائے

اختر جاوید | محمد اختر حسین اختر جاوید کا نئی نسل کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتا ہے ؎

تم اگر چاہو تو پڑھ لو ہمیں دیواروں پر ؛ اشتہارات کی مانند سٹے ہیں ہم بھی

غواصؔ کے شاگردوں میں، نبی رسول ناشرؔ بلیاوی، معین الدین معینؔ، معین الدین ماجدؔ، حیدر علی خاں حیدر رضا، سراج الدین شررؔ آروی، معین الدین بجلینؔ مدیرؔ، شمس الدین شاہ فطرتؔ مونگیری، اکبر علی اکبرؔ سکندر پوری، مرتضےٰ رہبرؔ بلیاوی، وغیرہ بھی اہم ہیں۔

امیر رضا کاظمیؔ، مستؔ کلکتوی، سہیلؔ واسطی، عطا کریم برقؔ، محمد اسمٰعیل بدرؔ، مائلؔ لکھنوی نوابؔ دہلوی، پرویز شاہدی، جرمؔ محمد آبادی، عبد المنان صبرؔ، آرزوؔ سہارنپوری، ساجدؔ ابروی، نازشؔ سکندر پوری، اعزاز افضل، حشم الرمضان، رونقؔ شام نگری کا شمار بھی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ **امیر رضا کاظمی** امیر رضا مظہری الکاظمی، بنگال کے مسلّم الثبوت استاد ہیں کلاسیکی شاعری کی ترقی میں، ان کا کردار، اہم ہے۔ وہ گلشن ادب کو، اپنے خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں ؎

کسی طرح سے بھی اس ریگ زار ہستی پر ؛ ابھر سکا جو نہ پورا وہ نقش پاہوں میں

ان کے شاگردوں میں انجم عظیم آبادی، خاص اہمیت رکھتے ہیں ؎

ترقی کرکے....



شاکر آسنسولوی

ترقی کر کے پہنچے ہیں وہیں پر
چلے تھے صدیوں پہلے ہم جہاں سے

مست کلکتوی گردش وقت نے اچھے اور باکمال ادبی فنکاروں کو گوشۂ گمنامی کا سایہ بنا دیا ہے۔ ان بدنصیب فنکاروں میں، غلام محمد مست بھی ہیں۔ مست اپنے دور کے باکمال شاعر تھے۔ اور قوالوں کی دنیا میں بھی، بحیثیت شاعر بہت مقبول تھے ——

ان کے آبا و اجداد، خراساں یا ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ اور پورنیہ (بہار) میں آباد ہو گئے تھے۔

بعد میں مست کے والد کلکتہ آئے اور اس شہر کو وطن ثانی بنالیا۔ ان کے والدین گوہند چند دھرلین (نزد امرتلہ گلی، کلکتہ) میں مقیم تھے۔ اور غالباً ۹۶-۱۸۹۵ء میں، وہ پیدا ہوئے۔ اور ان کے ذہن کی ابتدائی نشو و نما بھی، یہاں ہوئی۔ زندگی کے آخری ایام میں، انہوں نے نارکل ڈانگہ نارتھ روڈ میں، ایک مکان خریدا تھا۔ اور اپنے اس ذاتی مکان میں، منتقل ہو گئے تھے۔ اور اسی مکان میں بقول عبدالمنان صبر یکم اگست سنہ ۱۹۴۱ء میں۔ ان کی وفات ہوئی۔

مست کلکتوی، خواجہ الطاف حسین حالی کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں نے انہیں آرزو کا شاگرد بتایا ہے، جو غلط ہے۔ مست کا کلام، اس زمانے کے مشہور قوال محفلوں میں، سنایا کرتے تھے۔ "پیارے" جو عرف عام میں "پیارو قوال" کے نام سے مشہور تھے۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کالو (کلکتہ والے) اور صادق بھی —— پیارے قوال، ان کا کلام ریڈیو پر گایا کرتے تھے۔ پیارو کی آواز میں، بعض کمپنیاں مست کا کلام، "ریکارڈ" کی صورت میں فروخت کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان چھوٹے چھوٹے کتابچوں میں، جو قوالوں نے چھپوایا تھا، ان کا کلام ملتا ہے۔ علاوہ ازیں مست "پیشہ ور میلاد خواں" بھی تھے۔

مست کا بنگال کے اساتذہ شعراء میں، شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں "دیوان" مرتب کیا تھا، جس کی کتابت عبدالمنان صبر نے کی تھی۔ (اس دیوان کی تین کاپیاں، بنائی گئی تھیں)

مگر عمر نے ...



شغف سینائیؒ

مگر عمر نے وفا نہیں کی۔ اور یہ دیوان، زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ بقول صبر، بیگم مست نے "مخطوطہ دیوان" نظر حسین ساغر چنیوٹی (پنجاب) کے حوالے کر دیا۔ ساغر، مست کے عزیز اور رذی حیثیت شاگرد تھے ـــــ ساغر، پسر بجا اینڈ کمپنی (نواب بدرالدین اسٹریٹ، کلکتہ) کے مالک تھے۔ مست کے بعد وہ آصف بنارسی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور کچھ دنوں کے بعد اپنے وطن چنیوٹ (پنجاب) میں، انتقال کر گئے۔ ان کے صاحبزادے انور حسین بی۔ کام اور بشیر حسین ہیں۔

مست کلکتوی کا "مخطوطہ دیوان" ساغر چنیوٹی کے صاحبزادوں کے پاس موجود ہے۔

"دیوان مست" سے چند اشعار، ذیل میں درج ہیں ؎

اشک بہے بہا کرے درد بڑھے بڑھا کرے ❊ لذت سوز غم گھٹے ایسا نہ ہو خدا کرے

نگاہ شوخ نہ سنبھلی تو مجھ پہ وار کیا ❊ کہ جب قرار نہ آیا تو بے قرار کیا

جگر میں درد رگِ جاں میں زخم، دل میں خلش ❊ کسے کسے نہ تیرے تیر نے فگار کیا

خدا کے واسطے قسمیں نہ کھا، جانے دو ❊ تمہارے سر کی قسم میں نے اعتبار کیا

سمجھ لو جذبہ محبت کا پھر کرو وعدہ ❊ کہاں چھپو گے اگر میں نے انتظار کیا

تیری عنایت بجائے کھو دیا ساقی ❊ کہ بیخودی نے میرے سب کو ہوشیار کیا

بلا ہے، قہر ہے، آفت ہے مست دیوانہ ❊ یہ کیا کیا کس کو امیدوار کیا

جب کوئی پوچھنے کو حالت دل آتا ہے ❊ قطرہ آنسو کا ان آنکھوں سے ٹپک جاتا ہے

یوں تو بندہ سبھی سے ملتا ہے ❊ دل مرا کب کسی سے ملتا ہے

مست سے آپ کیوں نہیں ملتے ❊ آدمی آدمی سے ملتا ہے

اس کی آنکھوں نے سر بزم ٹھہرنے نہ دیا ❊ صبر مظلوم کو ظالم کی نظر نے نہ دیا

تم اور .....



ابوجعفر کشفی

تم اور پوچھو بات دل بیقرار کی
توبہ کرو یہ شان ہے پروردگار کی

دیکھو خزاں کو نیند نہ آجائے باغ میں
بلبل سنا رہی ہے کہانی بہار کی

شیشہ لنڈھک کے بزم میں ٹوٹا تڑاک سے
آخر نظر لگی نہ کسی ہوشیار کی!

تمنا ہے کہ تو پیش نظر ہو!!
تجھے جب دیکھ لوں سجدہ میں سر ہو

مستؔ استاد فن شاعر تھے۔ وہ زبان پر بہت زور دیتے تھے۔ یہ شعر بھی مستؔ سے منسوب ہے،؎

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد ⁂ سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

یہ چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے؎

او خوشی کے دیکھنے والے یہ غم بھی دیکھنا ⁂ مٹیں گے ایک دن الفت میں ہم بھی دیکھنا
او کتاب دلربائی پڑھنے والے رات دن ⁂ ہے کہیں اس میں لکھا لفظِ کرم بھی دیکھنا
مستؔ وہ جاتے ہیں منہ پھیر کر جانے بھی دو ⁂ زندگی سے یونہی منہ پھیریں گے ہم بھی دیکھنا
حضرت آدم کی لغزش کے تصدق جائے ⁂ ایک پیمانہ چھلک کے ایک میخانہ بنا

قوالی ؎

پری جمال، پری وش، پری ادا ساقی ⁂ ترے حجاب کے صدقے نقاب اٹھا ساقی
جلائے دیتی ہے مستی بھری ادا ساقی ⁂ کرم، کرم کہ پھنکا مستؔ مبتلا ساقی
ے بے آتی ہے خوشبو گلاب کی ⁂ ساقیا بھر دے بوتل شراب کی

مستؔ کے شاگردوں میں عبدالمنان صبرؔ، محمد شفیع ارمانؔ چھپروی، آغا مہدی رازؔ، محمد فراہم ثمرؔ فردؔ، خنداںؔ، مدحت جنگ بیخودؔ، حکیم کیفؔ وغیرہ، خاص اہمیت رکھتے ہیں ———

عبدالمنان صبرؔ بزرگ شاعر ہیں۔ انہوں نے شعر و ادب کی گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں ...

ہیں۔ نار کل ڈانگہ (راجہ بازار) میں ادبی فضا بنانے میں، انہوں نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ چند اشعار، پیشِ خدمت ہے ؎

نہ ہوتا شہرۂ قاتل نگاہی
دعا دے مرنے والے کو دعا دے۔

آنکھوں میں اب آنسو بھی دکھائی نہیں دیتے
رگ رگ سے لہو چوس دیا دل کی لگی نے

یا رات کے سناٹے میں بجتے ہیں مرے کان
یا واقعی اے صبر پکارا ہے کسی نے



سہیل واسطی

ان کے شاگردوں میں خورشید انور مختؔار اور غلام احمد عزیزی، قابل ذکر ہیں۔ **سہیل واسطی** سید اسرار الحق سہیل واسطی معروف شاعر ہیں۔ ان کے والد حکیم جینائی بھی، شاعر تھے۔ ان کا شعر ہے ؎

راست گزارو، دار چڑھو، حیلہ ہو لفظ 'انا الحق' کا
زیست کو سمجھا مرد وہ جس نے آنکھوں دیکھی موت کھڑی

سہیل واسطی، ترقی پسند شاعر ہیں، آسنسول میں ادبی فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کا کردار، خاص اہمیت رکھتا ہے ؎

آئینہ صورت نمائے رنگ و نیرنگ خودی ٭ میں ہی اپنا غیر ہوں اور میں ہی اپنا آشنا

آسنسول کے بیشتر شعراء، ان کے شاگردوں میں ہیں۔ **مائل لکھنوی** مائل کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے ؎

موت کا تو علاج ہے مائل ٭ زندگی کی دوا نہیں معلوم

بشیر احمد بشیؔر، ثمر آروی، شمیم میٹیابرجی، مائل لکھنوی کے عزیز شاگردوں میں ہیں۔ بشیر اچھا کہتے ہیں ؎

گلشن کا کوئی گوشہ محفوظ اب نہیں ٭ شعلہ فشاں ہے بجلی کا شانے جل رہے ہیں

تنویر صہبائی ...



تنویر صہبائی، ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ثمر آروی مائل کے شاگرد اور مٹیا برج کے استاد شاعر ہیں ؎

صحن چمن میں کس کے نشیمن کی آگ تھی
میں پھول چن رہا تھا کہ چنگاریاں ملیں

شمیم مٹیا برجی مٹیا برج کے استاد شاعر ہیں۔ اور مائل لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ؎

ہر گھر میں اک چراغ جلادیگی دل کی لو
بجھنے تو دو چراغ ہمارے مزار کا !

پرویز شاہدی

کلاسیکی شاعری کی کوکھ سے، ترقی پسند ادب نے جنم لیا۔ اور اس کے شعری ادب کے لیے پرویز شاہدی، سالک لکھنوی، کامران آختر، یونس آحمر، ساز، ابراہیم ہوش، حرمت الاکرام، مضطر حیدری، مظہر امام، قیصر شمیم، اعزاز افضل، سہیل واسطی علقمہ شبلی، احسان دربھنگوی، حشم الرمضان، ناظم سلطان پوری، محب الرحمن کوثر، محبوب انور، مضبوط ستون بنے۔ یونس آحمر، حرمت الاکرام، مظہر امام اور دوراں، بنگال کو داغ مفارقت دے گئے۔

پرویز شاہدی پرویز نے زندگی کے آخری لمحے تک، ترقی پسندی کی جڑ کو مضبوط کرنے کی سعی جاری رکھی۔ ان کے دو شعری مجموعے "رقص حیات" اور "تثلیث حیات" کے نام سے شائع ہوئے۔ "رقص حیات" خالص ترقی پسند شاعری کی نمائندگی کرتا ہے۔ جبکہ "تثلیث حیات" میں "نعرے" کے "نقوش" مٹتے ہوئے، بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی پرویز کا لہجہ نئی لہر کی گرفت میں مچلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تبدیلی بنگال کی ادبی دنیا کے لئے، خوشگوار اور نیک شگون ثابت ہوئی۔ نظم "بے چہرگی" ——— خاص طور پر "بانبی" میں پرویز کا شاعرانہ پیکر، جدید شاعری کے ملبوسات میں، دکھائی دیتا ہے۔ جابجا غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

اپنی اپنی کالک ملنے عکس ہزاروں لپکے ہیں
آئینے کی آنکھ بچا کر چہرۂ انساں بھاگ نہ جائے



اعزاز افضل

بنگال کی جدید شاعری کے قصر عالیشان میں، پرویز کی حیثیت بنیادی اینٹ کی ہے۔ اس باب میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔ پرویز کی ترقی پسند شاعری کے بارے میں کرامت علی کرامت نے لکھا ہے "ترقی پسندی کے دور میں نظم کے مقابلے میں غزل کو کمتر درجے کی صنف سخن قرار دیا گیا۔ اور اس سے سیاسی اور سماجی خدمات حاصل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کی گئی۔ اس میں تو کوئی نیاز حیدر کوئی ساحر لدھیانوی اور کوئی معصوم رضا راہی پیدا ہو گئے۔ لیکن گنتی کے پرویز شاہدی، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، مجروح اور غلام ربانی تاباں پیدا ہو سکے" [1]

دراصل بنگال میں ترقی پسند ادب کے لئے، نئے لہجے کی تخلیق، پرویز شاہدی نے کی۔ جو بعد میں ہمارے جدید شاعروں کا ماخذ بنا۔ اور صحیح معنوں میں، پرویز ہی بنگال کے پہلے جدید شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے قابل ذکر شاگردوں کے نام ہیں۔

اعزاز افضل

اردو کے منفرد غزل گو شاعر اعزاز افضل، پرویز کے عزیز ترین شاگردوں میں ہیں۔ انہوں نے پرویز کے رنگ شاعری کو وسعت دی ہے، اور اپنے منفرد لہجے کی بھی تخلیق کی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "زخم صدا" حال ہی میں شائع ہوا ہے افضل کے یہاں "اجتماعی کرب" اور "ذاتی احساسات" کی جھلک نمایاں ہوتی ہے ؎

کارواں کارواں تھی تنہائی ؛ لوگ سمجھے کہ ہمسفر آئے

مذکورہ شعر میں، اجتماعی احساس کی، اچھی عکاسی ہوئی ہے۔ اور اس شعر میں لہجے کی تبدیلی کے ساتھ "ذاتی کرب" کا اظہار حسین انداز میں ہوا ہے ؎

سفر تمام ہوا رخصت اے بصیرت چشم ؛ اندھیرے غار سے باہر نکل رہے ہیں ہم

---

[1] نئی غزل کا سفر بحوالہ طرح نو (علیم صبا نویدی)

اعزاز افضل کے شاگردوں میں **رئیس آنولوی** خاص اہمیت رکھتے ہیں اور بنگال میں مشاعرے کی جان، سمجھے جاتے ہیں ؎

ظلمت کی ہر خلیج کو نظروں سے پاٹ دو
سورج نہ بھاگ جائے کسی غار کی طرف



کمال جعفری

کمال جعفری اعزاز افضل کے شاگرد تھے۔ لیکن اب خود پر اعتماد کر کے شاعری کرتے ہیں اپنی انفرادیت کی وجہ سے، انہوں نے جدید شاعروں میں خاص جگہ بنالی ہے۔ جعفری کی شاعری، صاف ستھرے خیالات کی مظہر ہوتی ہے۔ وہ تصورات کی دنیا میں بھٹکنے کے بجائے، اپنے ماحول میں بکھرے سوچ کے دائروں کو "اشعار" میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہیں ؎

میں ہوں کتاب زیست کا مضمون بے بہا ✤ مجھ کو نہ پڑھ کے پھینکئے اخبار کی طرح

بدر امینی بھی افضل سے اصلاح لیتے ہیں ؎

نگاہِ گل پہ یوں اترا نہ بلبل ✤ کبھی منسوب تھے ہم بھی کسی سے

معصوم شرقی بھی اچھے شاعر ہیں۔ مختلف اساتذہ کے سائے میں، ان کے شاعرانہ ذہن کی تربیت ہوئی ہے۔ فی الوقت اعزاز افضل سے منسلک ہیں ؎

ہیں غنچہ و گل زینتِ دامانِ تصور ✤ زنداں میں بھی ہم سیرِ چمن دیکھ رہے ہیں

کیدارناتھ کیدار پرویز شاہدی کے عزیز شاگردوں میں تھے ؎

باعثِ عظمتِ جہنم ہیں ✤ لغزشیں ہم گناہ گاروں کی

کیدار کے شاگردوں میں سنتوک سنگھ معصوم، نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ؎

وقت کی دھوپ سے مرجھانا جھلسنا کیسا ✤ پھول بننا ہے تو ہر حال میں کھلنا ہوگا

صغریٰ سبزواری سیدہ صغریٰ سبزواری، بنگال کی بلند مرتبت شاعرہ ہیں ؎

تھے اس قدر جدائی کے لمحات سوگوار
کچھ بھی تلافیٔ غم ہجراں نہ کر سکے



سالک لکھنوی

اویس احمد دوراں اور مظہر امام کے شاعرانہ ذہن کی تربیت بھی، پرویز کے سائے میں ہوئی ہے۔ انہوں نے شاگردان پرویز سے زیادہ، پرویز سے فیض اٹھایا ہے۔ **مظہر امام** مظہر امام کی زندگی کا طویل عرصہ، کلکتے میں گذرا ہے۔ فی الحال وہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے وابستہ ہیں۔ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے، انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ اب جدید شاعر کی حیثیت سے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ؎

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری ٭ کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

اویس احمد دوراں ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے، دوراں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ فی الوقت مدھوبنی کالج (بہار) میں، لیکچرر ہیں ؎

یہاں کے لوگ دوراں میری شیریں دھن کے دشمن ہیں
یہاں بن کر مجاز و حافظ و خیام کیا ہوگا

سالک لکھنوی سالک لکھنوی بلند پایہ شاعر و ادیب ہیں، پرویز کے خاص دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ غزلیں کم، نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ طنز نگار کی حیثیت سے بھی، خاص شہرت رکھتے ہیں ؎

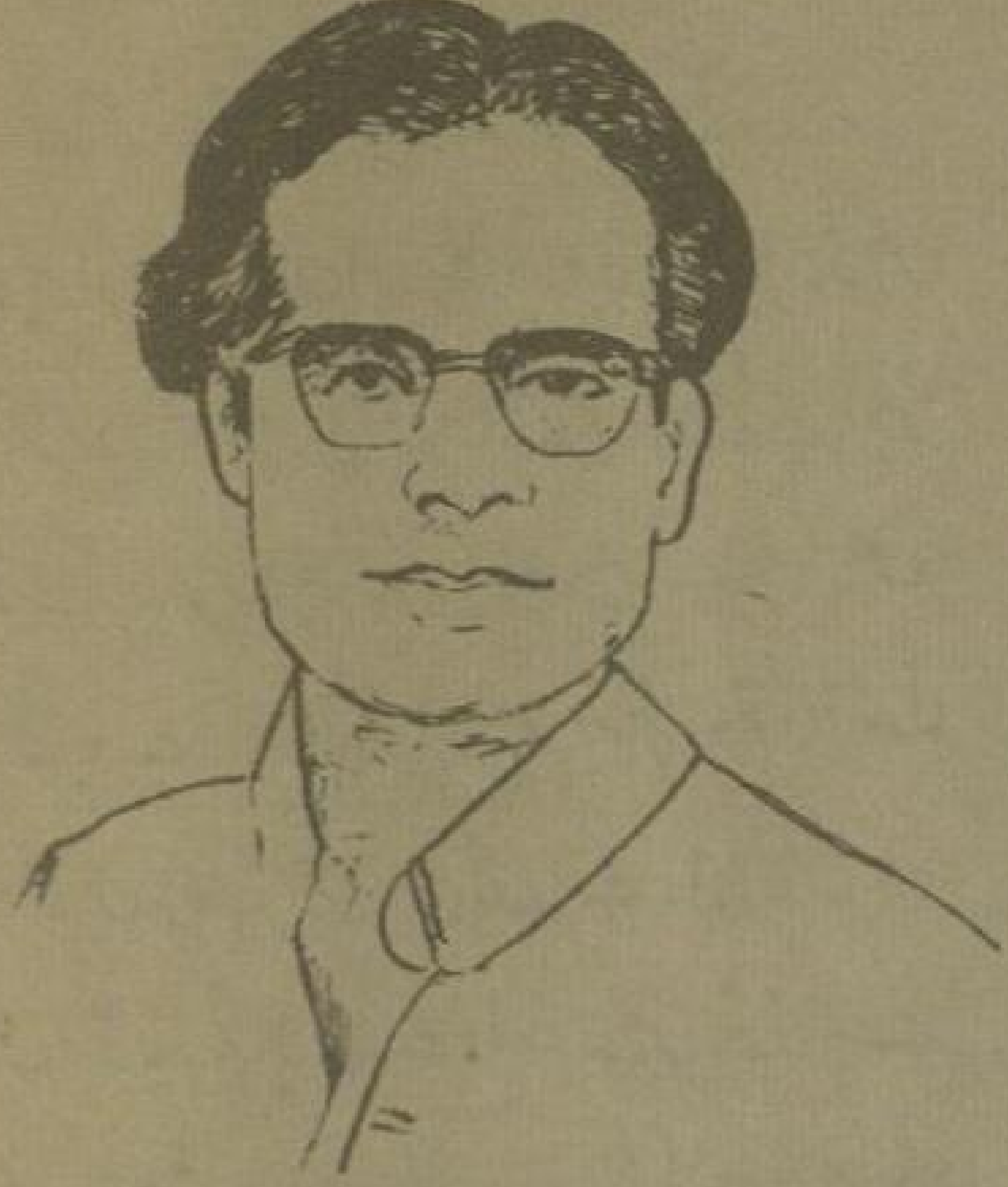
خدا شاہد ہے کتنے آستانوں پر جھکا ہے سر ٭ خدا شاہد ہے کتنوں کو بنایا ہے خدا میں نے

حرمت الاکرام حرمت نے بنگال میں شعری ادب کی جو خدمت کی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں فی الحال وہ اپنے آبائی وطن، مرزاپور (یوپی) میں مقیم ہیں ؎

آئینہ عکس کی چاہت میں نہ توڑا ہوگا ٭ راز جو ہوں گے مگر کیا کوئی ایسا ہوگا!

ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر نظام الدین، قطب شاہین، ثریا محمود ندرت، جذب آنولوی وغیرہم ہیں۔

مضطر حیدری...



علقمہ شبلی

مظفر حیدری مظفر، ترقی پسند شاعر تھے، بعد میں ان کا رجحان بدل گیا تھا اور وہ جدیدیہ ہوگئے تھے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پرویز کے بعد مظفر نے جدیدیت کو شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنایا مگر وہ "مصنوعی تنہائی" یعنی فیشن زدہ جدیدیت کے شکار ہو گئے۔ فرسٹریشن ——— کے شدید احساس نے انہیں ذہنی طور پر بیمار کر دیا۔ اور اسی احساس نے انہیں خودکشی کی طرف مائل کیا۔ اور وہ " مدرسہ تالاب" کی نذر ہو گئے ——— پرویز اور مظفر کی جدیدیت میں، یہ نمایاں فرق ہے۔ پرویز "نئے لہجے" کی بات کرتے ہیں، جبکہ مظفر "خود ساختہ المیہ" کی لپیٹ میں آکر، قبر کے تاریک کونے کی زینت بننے یا دریا برد ہونے کی خواہش کرتے ہیں "جام جم" ان کا شعری مجموعہ ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوا ؎

کوئی بھی شکل مکمل کتاب بن نہ سکی ؎ ہر ایک چہرہ یہاں اقتباس جیسا ہے

علقمہ شبلی علقمہ شبلی نے شاعر کی حیثیت سے، بنگال کے اردو شعری ادب پر گہرا نقش چھوڑا ہے وہ ذہنی طور پر، اسلامی ادب سے متاثر ہیں، انہیں جدید یا ترقی پسند شاعر کہنا، مناسب نہیں۔ ان کے شعری مجموعے "بے چہرہ لمحے" اور "حرف و صوت" منظر عام پر آچکے ہیں، جو ان کے مقام کے تعین کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں ؎

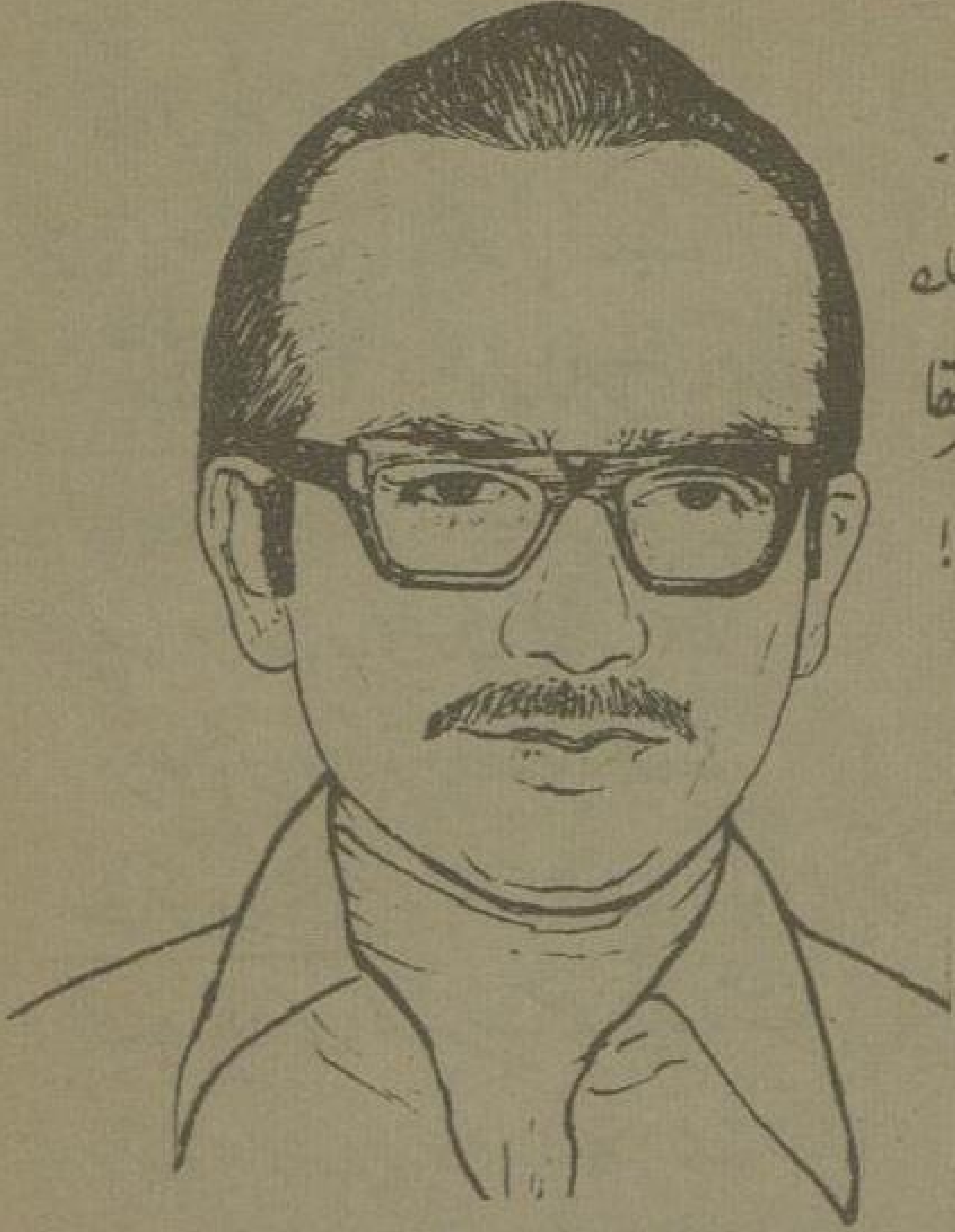
نظر آتے ہیں جلوے آج آئینہ در آئینہ ؎ جمال یار ٹکرایا ہے کس کی چشم حیراں سے

محب الرحمٰن کوثر مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ آسنسول میں ادبی فضا بنانے میں، انہوں نے موثر کردار ادا کیا ہے ؎

دورِ خرد ہو، عہد جنوں ہو کچھ اور ہو ؎ تلوار اپنے سر پہ لٹکتی ہوئی ملی

محبوب انور جواں سال ادیب و شاعر ہیں۔ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور اب

جدیدیت ...



سعید پریمی

جدیدیت کے اسیر ہیں۔ "م۔ الف" اور "س۔ ا۔ س" کے نام سے بھی۔ ادبی دنیا میں روشناس ہیں۔

برف کے گھر میں بھی اے دوست میں شعلوں میں گھرا تھا
میرا سایہ میرے سائے سے بہت دور کھڑا تھا!

نصر غزالی غزالی نے مختصر عرصے میں، کامیابی کی متعدد منزلیں طے کر لی ہیں۔ وہ جدید شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور بحیثیت جدید شاعر، اپنے لئے خاص جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں ؎

یہاں بے چہرگی ہی چہرہ چہرہ راج کرتی ہے
بڑھائی جائیں بہتر ہے دکانیں اب نقابوں کی

سعید پریمی اچھے شاعر و افسانہ نویس ہیں ؎

احساس کے چہرے پر یادوں کی خراشیں ہیں ؛ الزام بھی سب مجھ پر، کیوں آپ بھلا لیجئے

شہود عالم آفاقی شہود، شاگردان ابر میں، نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کہاں تک ساتھ دے برکھا کا پانی ؛ ندی جب ذہن کی سوکھی پڑی ہے

لہجے میں نئی تبدیلیاں بھی ان کے یہاں جگہ بنا رہی ہیں ؎

دعا رجینے کی سب کو دے رہی ہے ؛ بھکارن ہے مگر کتنی سخی ہے

مختار خاں مختار احمد خاں بارا غازیپوری، گذشتہ چند برسوں میں ابھر کے سامنے آئے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر و نظر کی پرچھائیاں موجزن نظر آتی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو، جو ان کے نظریۂ شاعری کی وضاحت بھی کرتا ہے ؎

غزل میں رنگ تغزل کے ساتھ ہے مختار ؛ جمالیات کے پہلو میں فلسفہ رکھئے

۱۹۷۲ء سے باضابطہ، انہوں نے شاعری شروع کی ہے۔ فی الوقت شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔

خواجہ حسن امام خواجہ حسن اچھے جدید شاعر اور با صلاحیت ادیب ہیں ؎

شعلۂ گل سے جلی جاتی ہے ہر شاخ چمن
زندگی میں ترے دامن کو بچاؤں کیسے

شمیم آنولوی خوش گو شاعر ہیں۔ اچھا کہتے ہیں اور اچھا پڑھتے بھی ہیں ؎

ہم عارض جاناں کو کنول کہتے رہیں گے
ہر جلوہ کو انوار غزل کہتے رہیں گے



اختر راہی

اختر راہی نام اختر حسین، ادبی نام، اختر راہی ہے۔ ان کے والد شرافت حسین برتر، شترخانہ (مونگیر، بہار) کے رہنے والے تھے۔ ان کے سائے میں۔ آپ کے علم و ادبی ذہن کی پرورش ہوئی۔ باضابطہ حکیم سید باقر حسین رضوی شاعر لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد، اپنے وجدان پر بھروسہ کرکے شعر کہنے لگے ___ فکر معاش میں، آسنسول آئے اور زندگی کا ایک طویل عرصہ یہاں گذارا۔ اور فی الحال کلکتہ میں مقیم ہیں۔ اچھے شاعر ہی نہیں، اچھے آرٹسٹ بھی ہیں، اور ذریعہ معاش یہی ہے آرٹسٹ اور شاعر کے ذہنی میلان نے، ان کی شاعری کو نکھارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر میں ، فن کار کی شبیہہ ہمہ وقت جھانکتی ہوئی ملتی ہے۔ اختر راہی کا یہ شعر، ان کے حسب حال ہے ؎

مری مسکراہٹوں نے مرے غم کی لاج رکھ لی ✤ بڑی تلخ داستاں ہے مری زندگی کے پیچھے

راہی بحیثیت آرٹسٹ اور شاعر، آپ کے سامنے ہیں بہتر فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

اُف یہ سورج کی شعاعوں سے پگھلتا موسم ✤ نور بکھرا تو ہر اک سمت نظارے چمکے
ناقدری کے دور میں راہی ہیرا کیا اور پتھر کیا ✤ دو کوڑی میں بکتے دیکھا آج کسی فنکار کا فن
غم دنیا، غم عقبیٰ، غم جاناں کی قسم ✤ دیکھئے دب گئے فکر کے انبار میں ہم
غم ہائے روزگار کا قصہ نہ چھیڑیئے ✤ میرا خیال مجھ کو پسینے سے تر ملا
آئینہ توڑ دینا تو آسان ہے مگر ✤ سچ سچ بتائیگا کوئی شیشہ گر ملا

میٹھولیا دیپ نرائن میٹھولیا، ۱۹۲۰ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد منی لال



میٹھولیا بھی، اچھے شاعر تھے۔ آپ نے احمرؔ، پرویزؔ اور اخترؔ کلکتوی سے مشورہ سخن کیا۔ آپ نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے وابستہ ہیں ؎

دل کی رگ رگ میں تڑپ کر دل کے ارماں رہ گئے
درد نے ڈس کر کہا یہ میں ہوں تنہائی نہیں

دیپ نرائن میٹھولیا

اقبال کرشنؔ مغربی بنگال کے ممتاز جدید شاعر ہیں۔ انہوں نے تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ تنقیدی شعور اور فکری زاویوں نے نئے لہجے سے ہم آہنگ ہو کر، ان کے شاعرانہ پیکر کو تراشا ہے ؎

پھر ناخنوں کے دشت سے تکتی ہیں بُتیں ٭ اجڑے گا پھر نشانِ صفا کا نگر تمام

رئیسؔ آنولوی رئیسؔ کے اشعار میں زندگی کی پرچھائیاں موجزن ہوتی ہیں۔ ان کے احساسات و خیالات جب اشعار کے سانچے میں ڈھلتے ہیں، تو کسی ایسے خوبصورت پیکر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جس کی روشن پیشانی کے گرد ذہانت کی دلکش لکیروں نے حصار ڈال دیا ہو ؎

امید کی شاخیں بھی کس درجہ گھنیری ہیں ٭ اک پیڑ کے سائے میں ہوتی ہے بسر سب کی
خوش عقیدہ دوستوں کی حسن کاری پر نہ جاؤ ٭ بت بنا دیتے ہیں لیکن پوجتا کوئی نہیں
مصلحت کی گرد میں چہرے نہ پہچانے گئے ٭ یوں تو بننے کو ہزاروں لوگ دیدہ ور بنے

مرکزی کلکتہ کے ادبی فنکار سدرشن، پروفیسر قمرالدین، ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی، پروفیسر ہیرالال چوپڑہ، بازغہ بیگم، ثاقبؔ آنولوی، عبداللطیف، ستار شاہدؔ، نیر نیازی، محمد صدیق صابرؔ کلکتوی۔ خالدؔ۔ محمد حسین ہنرؔ۔ ابراہیم اثرؔ وارثی۔ مولانا سرور خاں سرورؔ۔ بزمیؔ انصاری مولانا محمد یعقوب صفیؔ۔ رئیس الدین فریدی۔ الحاج عبدالقیوم شاکرؔ آصفی۔ شہابؔ لکھنوی۔ کنولؔ سیال کوٹی۔ رضوان اللہ علمیؔ۔ راشدؔ صدیقی۔ سوزؔ سکندر پوری۔ چھیلاؔ اعظمی۔ راقمؔ لکھنوی۔ ظفرؔ ادگانوی روشنؔ نیازی۔ صادقؔ نیر گھاٹوی۔ بشیر احمد بشیرؔ۔ عبدالغفار محشرؔ۔ عالمؔ باروی۔ فائزؔ آصفی۔ محمد عارفین عارفؔ...



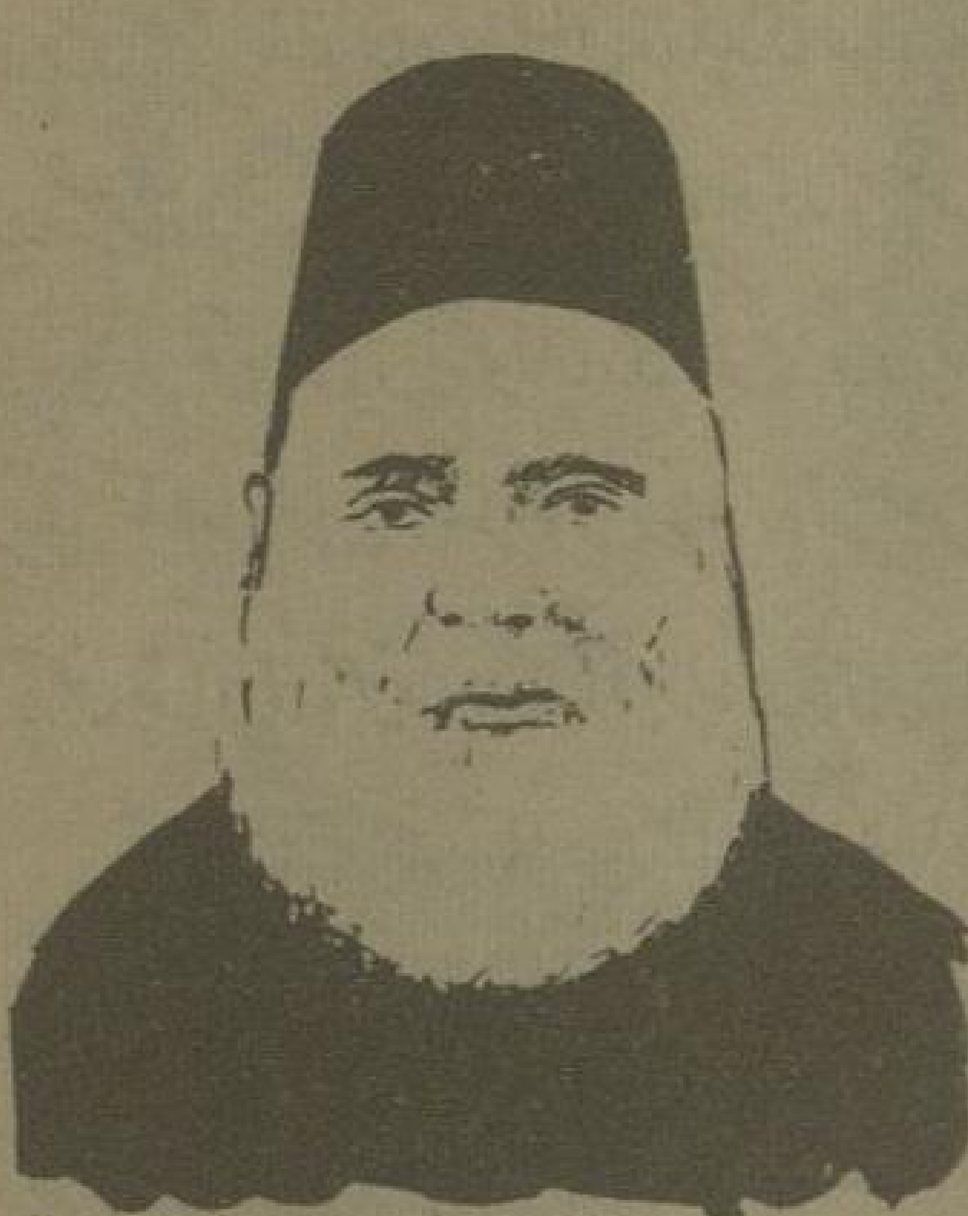
عاشق فیض آبادی

عارفین عارف ۔ ہاشم آفاقی ۔ نشاط سعید ۔ ایم۔ رفعت سیٹھی ۔ نور کلکتوی ۔ عاجز انصاری ۔ جلیل چاند پوری ۔ رفیق الزماں ۔ شفیق سلمانی ۔ حفیظ گیاوی ۔ اثر اعظمی ۔ احمر کلکتوی ۔ ادب آروی ۔ اشک آروی ۔ اشک مونگیری ۔ اقبال اعظمی ۔ تاثیر بلیاوی ۔ تمنا کلکتوی ۔ ثاقب دربھنگوی ۔ جوہر کلکتوی ۔ شاہ عزیز چشتی ۔ حافظ لکھنوی ۔ بی ۔ ایچ ۔ حسن ۔ قاسم علی حشمت ۔ خرم خلیل ۔ دانا ۔ محمد اسماعیل ذبیح ۔ راحت کلکتوی ۔ رشید جعفری ۔ غفار ساقی ۔ عبدالرشید قاتل ۔ محمد ہاشم گلشن ۔ سحر سہسرامی ۔ معصوم تاجپوری ۔ یونس آرزو ۔ شاد فیض آبادی ۔ شعلہ آروی ۔ اشرف چنگیزی ۔ عاجز کلیم ۔ محمد یسین عنبر ۔ شہزادہ فراق ۔ قمرالدین قمر ۔ قیصر سلطانپوری ۔ ماہر تاجپوری ممتاز گونڈوی ۔ ممکن الہ آبادی ۔ منیر لکھنوی ۔ ایس ۔ ایم ۔ ہاشم ۔ ناشاد ۔ ایس ۔ ندا ۔ نصرت چھپروی محمد یعقوب افضل ۔ نورالاسلام آذر ۔ محسن باعمن حسرت ۔ حسن اثر ۔ یوسف تقی ۔ محشر اشرفی ۔ کامل اختر ۔ ارشاد احمد بیتاب غازی پوری ۔ عبدالحمید برمی ۔ تمنا غازی پوری ۔ محب شادانی ۔ مغموم کلکتوی ۔ ہدف کمرہٹی ۔ پوشیدہ کمرہٹی ۔ شارق آنولوی ، شفیع نشاط ، خرم خلیل ۔ جہانگیر رباعی ۔

شاعرات

صالحہ بیگم مخفی ۔ شمع عظیم آبادی ۔ یاسمین اختر ۔ شرف النساء بیگم اشرف ۔ رخشاں روحی ۔ سلطنت آرا سیدہ بیگم ۔ بیگم قمر شہاب ۔ جمیلہ خاتون قمر ۔ ثریا محمود ندرت ۔ نیلوفر ناہید منزل لکھنوی ۔ ملکہ بیگم شمع ۔ مہ جبیں شوخ ۔ نسرین اختر صبا ۔ محمودہ بہار ۔ نسیم بانو نسیم ۔ قمر سلطانہ قمر ۔ افسر جہاں شرف ۔ تاج کریم تاج ۔ حمیدہ رحمن شبنم ۔ فیروزہ سحر ۔ عشرت بیگم عشرت ۔ شہناز مصطفےٰ ۔ ثریا پروین ۔ فیروز عبداللطیف ۔ حور لقا شمسی ۔ بلقیس بانو ۔ مہ جبیں ۔ زاہدہ نظر ۔ خالدہ رفعت ۔ نسرین ۔ یاسمین ۔ صفیہ اسلام ۔ رقیہ شوکت ۔ فریدہ کاشانی ۔ سلمیٰ پروین ۔ کنیز فاطمہ ۔ غزالہ پروین ۔ خورشید جہاں ۔ مہرالنساء مہر ۔ رضیہ کلکتوی ۔ ممتاز بیگم ممتاز ۔

مٹیا برج ....



عبدالحلیم شرر

میٹیا برج واجد علی شاہ اختر کے ساتھ، یہاں علم و ادب کی جو روشنی آئی تھی۔ اس کے دائرے کو تبسم، برق، بہار، ابد، جو، خلیل اثیر، درخشاں اور منظم طباطبائی نے وسعت دی۔ اور یہ منی لکھنؤ MINI LUCKNOW کہلایا۔ جاوید نہال کے بقول "وہاں (میٹیا برج) کی مٹی نے عبدالحلیم شرر لکھنوی جیسے عظیم ادیب اور ناول نگار کو جنم دیا۔"[1] یہ الگ بات ہے کہ شرر، میٹیا برجی کے بجائے لکھنوی کہلائے ———

شاہ اختر کے بعد بھی میٹیا برج میں، شعر و ادب کے خدمت گذاروں کی تصویریں، ابھرتی رہی ہیں۔ **ہمایوں مرزا** سید علی ہمایوں میٹیا برجی، ذی قدر شاعر تھے۔ ان کی صدارت میں جو مشاعرے ہوتے تھے، ان میں علامہ وحشت بھی، اکثر شرکت کرتے تھے ؎

جلترنگ چل کے سنو آج نئے بلبل کے ؛ ضربِ منقار سے بجتے ہیں کٹورے گل کے
خود بھی تم ہاتھ لگاؤ نہ مجھے چھونے دو ؛ آپ سے آپ بندھا ہے کہیں جوڑا کھل کے
اے ہمایوں ہے مجھے مجمع احباب پسند ؛ ہو گئی عید جہاں بیٹھ گئے مل جل کے
خون جب تھوکتا ہوں بوئے حنا آتی ہے ؛ جس پہ مہندی تری پستی تھی وہی سل ہے مجھے

جمشید مرزا ہمایوں مرزا کے شاگرد تھے ؎

مری آہ سوزاں کے اونچے شرارے ؛ جو چمکے تو سورج جو چھٹکے تو تارے

حامد علی خاں برقی اچھے شاعر تھے۔ ایک شعر مندرج ہے ؎

رخصت ہوئی بہار چلے آشیاں سے ہم ؛ روئے لپٹ لپٹ کے بہت باغباں سے ہم

ان کے علاوہ عابد علی عابد، حاجی خانم، نشتر میٹیا برجی، مانوس الدولہ محسن، مایوس، عبدالکریم نشتر میٹیا برجی

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ از:۔ ڈاکٹر جاوید نہال ص۱

وزیر علی .....

وزیر علی تجر، سلطان مرزا فیض، امجد علی خاں،
حیدر حسین ادیب، شوریدہ، سوز، سرور، سحر
بدایونی، تپش، حمایت گوالیاری، محمد سجاد، نیر
خیراتی، تفضل حسین فضل، محمد عالم، اختر حسین،
ریاض مٹیابرجی، شمیم اور ٹسن (ہزل گو) بھی اہم ہیں۔
آزادی کے بعد مٹیابرج میں، کچھ لوگوں نے
انفرادی و اجتماعی طور پر زبان و ادب کی جانب
توجہ مبذول کی۔ سید علی ظفر شمیم، کیف الاثر
شکیل مٹیابرجی، شیدائی کانپوری، نازش
مٹیابرجی، شاکر مٹیابرجی، حلیم ثمر مٹیابرجی، ساحل



ساز لکھنوی

مٹیابرجی، ساز لکھنوی، مظہر انصاری جیسے کہنہ مشق شاعر و ادیب، سامنے آئے۔ ساز لکھنوی
بلند پایہ شاعر اور استاد ہیں ؎

مجھ کو گماں یقیں کا یقیں پر نہ ہو سکا ؛ اتنے فریب وقت نے تقدیر کو دیئے
دو کام وہ لیتے ہیں بیک وقت نظر سے ؛ مایوس ہے کوئی کوئی شاداں سر محفل

رمز، آذر، تمنائی بارکپوری اور پردیسی بارکپوری، ان سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ آذر نورالاسلام
آذر، ساز کے عزیز شاگردوں میں ہیں ؎

ان بتوں کے گھر میں بھی میرا خدا کوئی نہیں ؛ عمر بھر پوجا ہے جن کو پتھروں کے شہر میں

رمز رمز مٹیابرجی کا شمار بھی، ساز کے اچھے شاگردوں میں ہوتا ہے ؎

کون جانے کب کہاں پتھر چلے ؛ کوئی شیشے کا نہ لیکر گھر چلے

حلیم ثمر عبدالحلیم ثمر، مٹیابرج کے استاد شاعر ہیں ؎

میں پھول چن رہا تھا کہ چنگاریاں ملیں ؛ صحن چمن میں کس کے نشیمن کی آگ تھی

ان کے شاگردوں میں ابد مٹیابرجی، مشتاق جاوید، آسی آروی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ جذب
آنولوی، اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی، مٹیابرج میں زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

ادب اور زندگی دونوں میں کچھ ایسا تعلق ہے
جدا جیسے کبھی ساحل سے دریا ہو نہیں سکتا


وفا راشدی

نئی نسل کے شعراء میں حشمت کمال پاشا، انور حسین انجم، حیدر حسن کاظمی، سعید کاشف، فاروق شفق، تاج محمد تاج، شمیم انور، مقصود عالم شبنم، ظفر العالم خطری، دلکش اعظمی، صابر اعجاز، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

دیگر شاعر و ادیب

عزیز الحسنین ہاشمی، غلام معین الدین، وہاب پردیسی، اظہر عباس، محرم لکھنوی، شارب ردولوی، عبدالستار ابد۔ رحیم اللہ تاج، رفیق مستانہ، محمد شاکر، محی الدین برق، خضر دانش، دانا سکندرپوری، افسر مٹیابرجی، بقا انتظامی، رنگین مٹیابرجی، روح مٹیابرجی، ریاض مٹیابرجی، شاکر مٹیابرجی، شاہد مٹیابرجی۔ محمد شفیع فکر مٹیابرجی سمیع اللہ فہمی، کیفی مٹیابرجی، نعمت مٹیابرجی، نور مٹیابرجی، نعیم مٹیابرجی، سلیم مٹیابرجی، شہید مٹیابرجی۔

خضر پور

یہاں شعر و ادب کو فروغ دینے میں حافظ مختار اور مولوی عزیز النبی خاں عزیز نے ابتدا میں، اہم کردار ادا کیا۔ مولوی عزیز حبیب النبی خاں صولت کے چھوٹے بھائی تھے اور صولت، حضرت وحشت کلکتوی کے بہنوئی تھے۔ اس زمانہ میں جونیر مدرسہ میں انجمن "شغل احباب" کی جانب سے، ادبی نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جس میں کلکتے کے مشاہیر شعراء بھی شرکت کرتے تھے، مثلاً مست کلکتوی وغیرہ۔

عزیز

عزیز النبی خاں المتخلص بہ عزیز، بلند پایہ استاد شاعر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں، ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۰، ۶۵ سال تھی۔ اردو، عربی، انگریزی اور فارسی زبان پر قدرت رکھتے تھے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سنیر لیکچرار بھی تھے۔ قرآن شریف کا ترجمہ انہوں نے، اردو اور بنگلہ زبان میں کیا تھا۔ ان کی شاعری میں تصوف اور فلسفہ کی پرچھائیاں جابجا رقصاں نظر آتی ہیں ؎

نطفۂ انساں میں اس کی جہد کا آغاز ہے ؛ دیکھتا ہے دیدۂ دانا جو ہر دم باز ہے



خواجہ حسن امام

ان کے شاگردوں میں رشید الزماں خلش، محمد اسحاق، افضل، رضی ناطقی، محمد صدیق ندرت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **حافظ مختار** حافظ نظیر الحق مختار اچھے شاعر اور استاد کی حیثیت سے، بہت مقبول تھے ۱۲۹۹ھ میں حاجی پور ضلع ویشالی (مظفر پور) بہار میں پیدا ہوئے۔ غالباً ۱۹۳۰ء سے، خضر پور میں مقیم ہیں۔ شاد عظیم آبادی کے ہمعصروں میں آپکا شمار ہوتا ہے۔ خضر پور میں ادبی فضا قائم کرنے میں، حافظ مختار نے اہم کردار ادا کیا ہے ؎

ایک برہنگی مری پوشش بہت کی ہو گئی ÷ میری قبا کے تار تار بٹ گئے خار خار میں

ان کے شاگردوں میں ادیب خضر پوری، شفیق، ضیغم، محمد الیاس تلیل، شغل، غنی، غلام محی الدین حسرت اور منشی ظہیر، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **آزادی کے بعد** خضر پور کے اردو ادبی مزاج میں، نمایاں تبدیلی آئی ہے، وہاں کے شاعر و ادیب، زبان و ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں۔ وہ لائق تحسین ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر رضی ناطقی، ناظم سلطانپوری، جوآن سندیلوی، سلیمان نہر، ناوک لکھنوی، پیام ناطقی، ظہیر، تاشاد دربھنگوی، سید لطیف الرحمن اور حافظ مفاضل الحق نہری کی خدمات مستحسن ہیں۔ ادیب خضر پوری۔ تاثیر انجمی۔ افضل بی۔ اے۔ مصور خضر پوری، عاشق فیض آبادی۔ ڈاکٹر عطا آروی۔ حکیم سالم ادیب۔ حیدر وارثی۔ پیغام تابانی۔ بدر دربھنگوی۔ عبدالحمید خضر پوری۔ فرحت مظفر پوری۔ ثمر خضر پوری۔ ضرب لکھنوی۔ خواجہ حسن امام۔ شیدا خضر پوری۔ عشرت خضر پوری۔ کامل خضر پوری۔ حیات وارثی۔ پروین انجم۔ شہباز دربھنگوی۔ نوش مظفر پوری۔ عارف خضر پوری۔ مبین مناوی۔ انور برہمی۔ عبدالجبار ناز۔ گھائل عظیم آبادی وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

بیلگچھیا

بیلگچھیا میں علم و ادب کا سورج، کب طلوع ہوا؟ اس سلسلے میں یقین کے ساتھ، کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہر حال اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ سید محمد فخر عالم (شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بھانجے اور استاد

ذوق ...

ذوقؔ کے شاگرد تھے، وہ اکثر رنگون جاتے ہوئے
بیلگچھیا میں ٹھہرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر
۲۲ سال کی تھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سید
فخر عالم۔ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔
اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بیلگچھیا میں علم و ادب کا
چراغ، انہوں نے روشن کیا تھا جس کی روشنی
روز افزوں پھیل رہی ہے۔ ان کے بعد یہ شعرائے
کرام، نمایاں حیثیت رکھتے ہیں محمد حنیف
۱۸۹۵ء میں بیلگچھیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد
حکیم مولوی دین محمد، حکیم صادق کے تلامذہ میں



شہود عالم آفاقی

تھے۔ حنیفؔ، اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ایک رباعی پیش خدمت ہے ؎

مرا فکر تاریخ شد اے حنیفؔ ✤ چوں نوشیدہ جائے ازل فوجدار
در خلد وا شد و رضواں بگفت ✤ برو طالب رحمت کردگار!

اور یہ چند اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

گرم اشکوں سے مرا دامن تر جلتا ہے ✤ یہی برسات ہے وہ جس سے کہ گھر جلتا ہے
آہ کرنے سے نہ رو کو ابھی باقی ہے ہوس ✤ دونوں عالم کو ذرا زیر و زبر ہونے تو دو
جلا دیوے ہے غیروں کو وہ خود جلتا ہے ✤ دیکھ تو شمس جلے ہے قمر جلتا ہے

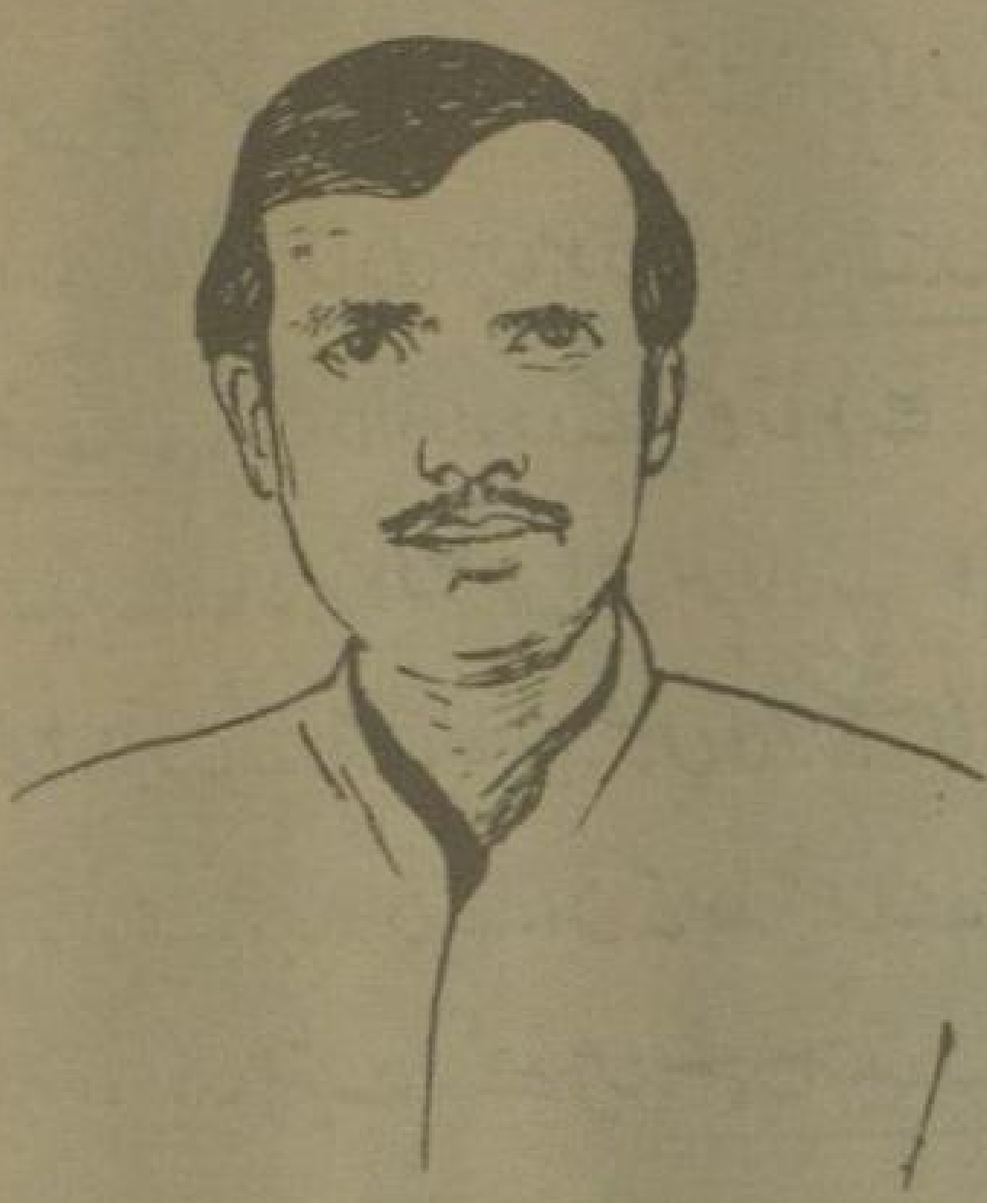
محمد یوسف امیؔ ہوڑہ میں رہتے تھے، بعد میں بیلگچھیا میں بس گئے تھے۔ ۲۵-۱۹۳۰ء میں انکا
انتقال ہوا ؎

آب شمشیر کا پینا نہیں آساں امیؔ ✤ حلق تک آکے اٹکتا ہے یہ وہ پانی ہے
سینکڑوں راستے ہیں ملک عدم کے لیکن ✤ تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

واحدؔ۔ عبدالواحد، واحدؔ بیلگچھیا کے استاد شاعر تھے۔ ان کا مخطوطہ دیوان، ان کے ایک شاگرد
کے پاس محفوظ ہے۔ ان کے شاگردوں نے، ان کی زندگی میں "بزم واحدی" قائم کی تھی۔ ان کے خاص

شاگردوں میں خرد، احمد علی اور اثر ہیں ؎

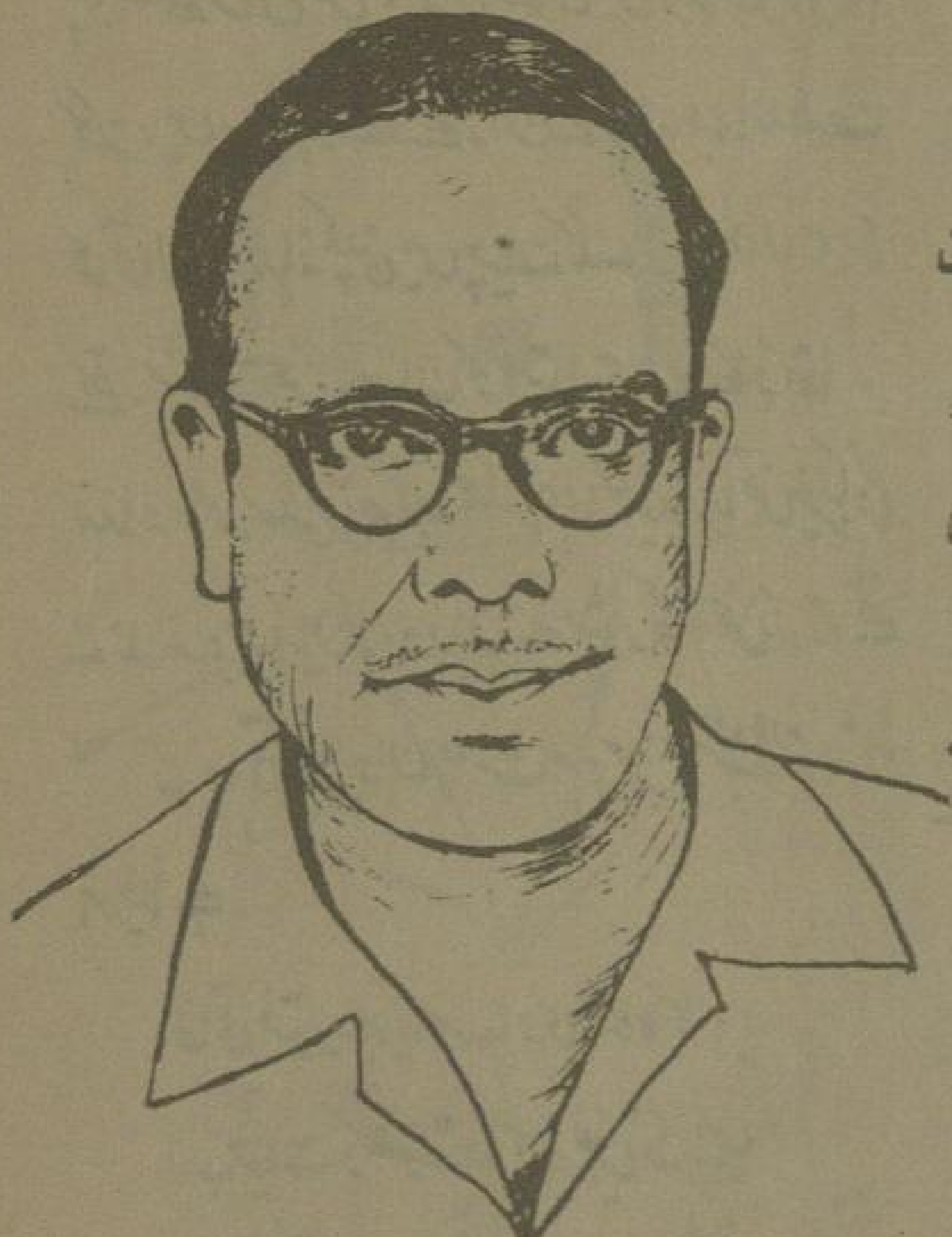
واحد دو چیز کھوتی ہے در سخن کی آب
داد سخن نا اہل سکوت سخن شناس



احقر غازیپوری

سلطان سلطان احمد خاں، محمد آباد (غازیپور) کے رہنے والے تھے۔ اور بیلگچھیا کے قدیم شعراء میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں (ماسٹر) محمد اسلم بھی، واحد و سلطان کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلم، علامہ وحشت کے تلامذہ میں تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اسطرح وہ بیلگچھیا کے پہلے مسلم گریجویٹ ہوئے۔ ان کے بھائی محمد ادریس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور وہ بیلگچھیا کے پہلے میٹرک تھے۔ اسلم ۱۹۳۲ء میں کاؤنسلر ہوئے۔ بیلگچھیا کا پہلا کاؤنسلر ہونے کا ان کو شرف حاصل ہے۔ **آزادی کے بعد** بیلگچھیا میں "خاندان ابر" (شاگردان ابر احسنی و متعلقین) نے اردو شعر و ادب کی بیش بہا، خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں ساجد ابروی اور شہود عالم آفاقی کی خدمات مسلم ہیں۔ حکیم عبداللطیف اور احقر غازی پوری وغیرہ نے بھی زبان و ادب کی ترقی میں، نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے علاوہ خرد غوث پوری، صوفی ابروی نہالی، رحمت غازیپوری، شرف غازیپوری، اشک آروی، ناچیز کلکتوی، شبیر ابروی، غلام معین، بدر جمال ابروی، مختار مشرقی، سعید آذر، سرور کلکتوی، مختار شاہد، عقیل ضیائی، دانش کلکتوی، احمر ابروی، مرتضیٰ حسین مرتضیٰ، عشرت نبی نگری، ناظم گونڈوی، ناظم بلیاوی، سہیل تاجپوری، رحمت کلکتوی، مشتاق جوہر، ستار شمیم، عثمان ثمر، اسلم اعجاز، یوسف نہال، بدر جمال، کاوش رانی پوری، بدنام سحر۔ **کاشی پور** نظام الدین نظام، یونس آرزو، رشک آروی، معصوم تاجپوری، شفیق سلمانی، عبدالرحمن جاوید، اطہر جونپوری، جمال کاشی پوری۔ **انٹالی** چھاتو بابو لین، پھول بگان، موتی جھیل اور ٹنگرا کا تعلق، انٹالی حلقے سے ہے۔ یہاں کے شاعر و ادیب نے زبان و ادب کی گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں۔ سید امیر حسن بدر، قمر صدیقی

کامران اختر...



محمد اسمٰعیل بدر

کامران اختر، یونس احمر، فضلی صدیقی، محمد اسمٰعیل بدر، اثر صدیقی، مولانا ضیاء الہدیٰ قادری اور مولانا غلام صمدانی اشرفی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **بدر** امیر حسن بدر آروی، استاد شاعر تھے۔ ان کو صغیر بلگرامی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کا دیوان، ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا۔ "خمخانۂ بدر" ۶۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک شعر مندرج ہے:

ناقدری زمانہ کا شکوہ عبث ہے بدر
احباب کو نہیں ہے کمال و ہنر پسند

کامران اختر ترقی پسند شاعروں میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ؂

زندگی گل پہ شبنم اشک حسرت ریز ہے ٭ بے ثباتی بہار باغ درد انگیز ہے

یونس احمر بلند پایہ شاعر تھے۔ اور بنگال میں باضابطہ منظوم ترجمہ کی جانب، انہوں نے توجہ کی ؂

عشق کی آگ محبت کا جنوں خیز الاؤ ٭ موسم گل نے ہرے کر دئے پھر جسم کے گھاؤ

محمد اسمٰعیل بدر پروفیسر بدر اچھے شاعر اور استاد ہیں۔ بیخود مرحوم کے خاص دوستوں میں ہیں۔ اور بحیثیت استاد شاعر، اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ؂

خوگر غم پر اور بھی ٹوٹ پڑا ہے کوہ غم ٭ حیرت زدہ ہے آسماں، صبر و قرار دیکھ کر
سرور کائنات کا رتبہ ہے کس قدر بلند ٭ جھک گیا آسمان بھی ان کا وقار دیکھ کر

سرور خاں سرور، خالد، محمد اسحٰق ہمت، نسیم کلکتوی، مسلم کلکتوی، اسحٰق نصیب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نصیب، بنگال کے مشہور شاعر تاباں القادری کے استاد تھے۔ **ٹنگرا کیل خانہ** کلکتہ کا ایک دور افتادہ علاقہ ہے۔ مزدوروں کے اس پس ماندہ علاقے میں، زندگی کی روشن تاریں، بکھرنے نہیں پائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شمع ادب روشن ہے۔ جس کو یہاں کے مخلص شاعر و ادیب، اپنے خون جگر کا ایندھن مہیا کر رہے ہیں۔ **حامی کلکتوی** رضا احمد نام، تخلص حامی ہے۔ وہ باسٹھ

چونسٹھ ...



حاتی کلکتوی

چونسٹھ سال قبل، کرانی بگان لین (گلاب سین لین) کلکتہ، میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد عبداللطیف کلان لائن جہاز کمپنی میں چیف کک (COOK) تھے۔ شعر و سخن سے ان کو ابتدا ہی سے لگاؤ تھا۔ لہٰذا وہ محمد صدیق صابر کلکتوی (تلمیذ ریاض خیرآبادی) کے تلامذہ میں ہیں۔ اور ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ حاتی کا دیوان "شام و سحر" (۱۹۸۳ء) شائع ہو چکا ہے۔

حاتی فتور ہے یہ ہماری نگاہ کا !!
آب حیات ڈھونڈھ رہے ہیں سراب میں

دیوان حاتی، تقریباً ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور حاتی کا یہ شعر "دیوان حاتی" کی پیشانی پر چمک کر حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے ؂

اے دوست یہ دیوان ہے قرآن نہیں ہے ✧ اغلاط سے خالی میرا دیوان نہیں ہے

حاتی کلکتوی کے علاوہ، یہاں یہ شعراء و ادبا بھی زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ شفیع عالم سرور، محمد قاسم بھارتی، حبیب الرحمٰن حبیب، علی جان حفیظ، محمد قمر، مطلوب حسین (کشمیری ٹی کمپنی) محمد صدیق محمد کاظم، موتی قوال، (ڈاکٹر) محمود عالم احسن، عبدالسلام۔ شمس العارفین گلشن، نشتر وغیرہم ——

موتی جھیل، ٹٹاگڑھ اصغر علی شمیم، محمد یٰسین سرخوش، محمد یوسف عادل، محمد اسحاق راحت، سرور خاں سرور، خالد، محمد اسحاق ہمت، نسیم کلکتوی، مسلم کلکتوی، اسحاق نقیب حبیب الرحمٰن حبیب، عبدالحفیظ قدرت، عبدالجبار شاہد، قاسم ماسٹر (ہزل گو) ——

توپسیا ڈاکٹر عین الحق محسن، ریاض فردوسی، نسیم اختر، شفیع نشاط، نورالدین دانا، نیلوفر ناہید، کنیز فاطمہ، امان اللہ امان، نزاہ پروین، فخرالدین احمد، سہیل انور ثاقب، سیف بھاگلپوری، فیروز انور شفق، محمود ایوبی، محمد قمر، ایم۔ اے۔ رشید، خورشید جہاں، مبین الدین ایم۔ اے۔

ہوڑہ

ہوڑہ بھی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ شکیل بنی نگری، سیفی اعظمی، حاذق انصاری بھی،

ہوڑہ ...



ابن امین بازید پوری

ہوڑہ کے اساتذہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں ـــ

حاذق انصاری محمد یونس حاذق انصاری، اچھے شاعر اور مخلص انسان ہیں ؎

مفلسی برہمی سکھاتی ہے

کیوں نہ برہم ہو آدمی کا مزاج

ان کے علاوہ احسن شفیق، حیدر صفت، مراد علی انجم، احمد حسین ثاقب، عشرت بنی نگمری، وحشی ہوڑوی، مرتضیٰ علی تاباں، حاصل یوسفی، انور بلیاوی، مختار احمد مسافر، خلیل احمد خلیل، اکبر سکندر پوری، مجید قریشی، تنویر نظر، عابد عباسی عزم حمیدی، اشہر ہاشمی، نور پیکر۔

ہوگلی و ۲۴ پرگنہ

ساگر چاپدانوی، حشمت نعیم، کمال الدین کمال۔

آسنسول

مغربی بنگال کے اردو مراکز میں "آسنسول" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے بعد، اس اردو ادبی مرکز نے، نمایاں ترقی کی ہے۔ اور زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں، بہتر کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کے بزرگ شاعروں میں مولانا حکیم ابوالفرح کمال مینائی ؒ، علامہ عبدالرشید شغف سینائی، ظفر داناپوری، مولوی عبدالشکور شاکر آسنسولوی، انجم برنپوری سہیل واسطی، اسرائیل حقیر، محب الرحمٰن کوثر، احمر جلیسری، رونق نعیم، مجبوب انور، ادریس صدر سیف سمستی پوری، ساحل مونگیری، اسلم در بھنگوی اور نعیم حیدر کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد کے شعرا میں قابل ذکر شعرائے کرام یہ ہیں۔ **شریف ارشد**۔ ارشد مونگیری کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ اب شریف ارشد، قلمی نام ہے۔ آسنسول کے اچھے شاعر اور نقادوں میں، شمار ہوتے ہیں ؎

پاؤں لمبا کرکے سائے سوئیں گے ؛ ہے مقدر چڑھتے سورج کا زوال

مضطر عظیم آبادی۔ عبدالمنان مضطر عظیم آبادی، صاف و ستھرا ادبی مذاق رکھتے ہیں۔ ہر دلعزیز و مقبول شاعر ہیں ؎

میں ضبطِ غم سے کام تو لے لوں مگر حضور ؛ کب تک دبی رہے گی بھلا گھر میں گھر کی بات

شبنم ...



شبنم برنپوری

شبنم برنپوری محمد ادریس شبنم برنپوری معروف شاعر ہیں ؎

میری پیشانی پہ سجدوں کی تڑپ آنے دو
در کی تخلیق کرے گا مرا سر آپ سے آپ

سلیم قادری آسنول کے جانے پہچانے شاعر ہیں ؎

ہمراہ قافلے میں ہیں دونوں طرف کے لوگ
ہے کوئی دوستی میں کوئی دشمنی میں ساتھ

خلیل رمزی خلیل احمد خلیل رمزی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور اپنے رنگ میں اچھا کہتے ہیں ؎

بند کمرہ ہے زندگی میری ؏ گھٹ رہا ہوں وجود کے اندر

نسیم آذر صنم اقبالی اور نسیم آذر، ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ اردو شعر و ادب سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں ؎

ہمارا عزم کوئی خضر راہ سے کہہ دے ؏ کسی کے نقش قدم پر قدم نہیں رکھتے

اقبال امام عاصی شعر و ادب سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں۔ بحیثیت شاعر و ادیب، اردو دنیا میں، جگہ بنا رہے ہیں ؎

رنگینئ بہار چمن جن کے دم سے تھی ؏ ان کی وفا کا خون ترے پیرہن میں ہے

احمر جلیسری علامہ ابر احسنی کے عزیز شاگردوں میں ہیں، فی الوقت رانی گنج میں مقیم ہیں۔ اچھے شاعر اور مخلص انسان ہیں ؎

شام غم کی تاریکی کچھ نہ کچھ تو کم ہوگی ؏ شمع دل ضیا دے گی اشک جھلملائیں گے

ثمر سرمیروی جمیل اختر ہاشمی، ادبی نام ثمر سرمیروی ہے ؎

درد ہے غم ہے بے قراری ہے ؏ زندگی پھر بھی مجھ کو پیاری ہے

ان کے علاوہ بھی بہت سے شاعر و ادیب، آسنول میں اردو کی ترویج و ترقی اور اشاعت میں

حصہ لے ...

حصہ لے رہے ہیں۔ ابوالفرح کمالی، اختر جمالی شاہین الہ آبادی، فرہاد مونگیری، نثار احمد نثار، شاہد برنپوری، رہبر جمیدی، احسان ثاقب ، نعیم اشفاق، اختر مظفر پوری۔ اخگر جھروی ، اسرائیل شارق، اسماعیل شارق، ابراہیم گڈبڈ، آشا شرما، اشرف آزاد ، اشک جمالی آفتاب احمد شوری، افضل امام ، امین انصاری شرم ، افضل سری پوری، امین غافل، انجم باروی، انجم برنپوری، انیس فاطمہ، امین بھاگلپوری



محبوب انور

این۔ اے۔ ذکی، بسمل محمودی، بیتاب داناپوری، پرتم برنپوری، جمال روشن، جھنجھٹ ، حاتی اظہری، حبیب اللہ خاں حبیب، حیات اظہر، خاموش غازی پوری، خورشید داناپوری، داؤد طالب دربھنگوی، ذکیہ انور، رفیق راعی، رمضان علی ناشاد، رفعت پرویز، رونق، راشد اورنگ آبادی، سلام جونپوری، سلطان سلیم انجم، ساز عظیم آبادی، شاکر آسنسولوی، شرر عظیم آبادی، شاد عزمی، شمیم مذاق، شوکت عمر بیتاب، شیدا آسنسولوی، شیدا برنپوری، شکیل احمد، صابر آسنسولوی، صابر اجمیری، صادق حسین رضوی، صبا سہسرامی، ظفر داناپوری، عمیرالدین آرزو، عابد نونہروی، عارف بنگروی، عاشق کلکٹوی، عاصم صابری، عبدالباری نادان، عبدالستار راز، عبدالغفار راہی، عبدالغفار ہمدم، عثمان تشنہ، عثمان غنی طالب، عبدالعظیم فانی، عزیز احمد عزیز، علی اشرف صبوحی، فانی صدیقی، فدا حسین فدا، قاسم تسنیم، قدوس اعظمی، قمر مانبھوی، مشتاق احمد مونگیری، محشر انڈالوی، محمد کوثر علی کوثر، ممتاز نکری ، نسیم آزاد، نشتر شاہدی نور شمسی، نوشابہ سری پوری، وصی احمد وصی، ہاشم خونیں، ہلچل آسنسولوی ـــــ آسنسول میں کئی اچھے ادیب، افسانہ نگار اور نقاد ابھر کے سامنے آئے ہیں، سہیل واسطی، شمس ندیم اور عابد ضمیر نے، یہاں افسانوی ادب کا جو چراغ روشن کیا تھا۔ اس کی روشنی، اب دوسروں کو بھی، متوجہ کرنے لگی ہے۔ "ہمارے افسانے" (جولائی ۱۹۹۳ء) کے نام سے، آسنسول کے چند افسانہ

نویسوں ...

نویسوں کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس کے مرتبین عبدالمتین، نذیر احمد یوسفی اور شین کریمی ہیں اس افسانوی مجموعے میں، جنکی تخلیقات شامل ہیں، انکے اسم گرامی یہ ہیں۔ سہیل واسطی (بیش بٹن اور پلنگ) شمس ندیم (بے نام آدمی) مشتاق اعظمی (دھند) عابد ضمیر (لاش کا کھپڑ) عبدالمتین (رنگوں کا تعاقب) نذیر احمد یوسفی (یاس بیدار ہے) شین کریمی (صلیب احساس کی) نعیم اشفاق (نصف دائرے کا نوحہ) جلیل عشرت جلیل (لمحوں کا زہر) قیام انیس (عکس) عشرت بیتاب (بے سورج



رئیس آسنولوی

سویرا) انور خورشید (اگنی پریکشا) قدوس اختر (زرد پتوں کا درد) ضیاء الرحمٰن ضیا (زہر کی آگ) احسان ثاقب (ردّ عمل) ایم۔ اے۔ عالم (سزا) ایم۔ عالم (فریاد گھٹی گھٹی سی) صغیر شاہد (تصور کی جونک)۔ ادیبوں میں سہیل واسطی، محبوب انور اور محب الرحمٰن کوثر اور بحیثیت نقاد شریف ارشد، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ **افسانہ نگار، نقاد، ادیب وصحافی** آباد خاں، ابن موسٰی، محمد اسلم عندلیب، احسان ثاقب، اظہار الاسلام، اکبر انصاری، آفتاب احمد شورتی، افضل امام اقبال امام عاصی، افضل سہری پوری، انوار ادیب، ایم۔ این۔ بھارتی۔ ایم۔ نظام، بلیغ آسنولوی، ثمر سیمروی، جابر فیروز پوری، سائرہ روحی انجم، س جمہوری، سخاء اللہ نظر، سلیم برنی، شریف ارشد، شاہد صدیقی، شکیل احمد، صغیر احمد انصاری، طاہر رحیمی، عاشق علی برنی، عرفان رضوی عظمت اللہ دانش، فخر الحسن فخر، محمد حسن آزاد، محمد نثار، مرتضٰے ماہر، م رضوی، مشتاق درانی، ممتاز نکسری، منصور انجم، منصور انصاری، محمد اصلح، نثار احمد شوخ، نور الحسن وغیرہم۔

مضافات بنگال کے غیر معروف علاقوں میں بھی، اچھے شاعر و ادیب، موجود ہیں۔ **کانکی نارہ** حشم الرمضان، صابر گیاوی، وفا سکندرپوری، بشیر الدین ظامی، بار ود۔ **جگتدل** معصوم شرقی، خلش امتیازی، دل عرفانی، اقبال نور۔ **شام نگر** زار غازیپوری، رونق شام نگری، ارمان شام نگری،

اظہر ...



رضی ناطقی

اظہر اورنگ آبادی، اجدؔ شام نگری، **تیلنی پاڑہ** کمال الدین کمالؔ، قاہرؔ سلطانپوری، مومن خاں مومنؔ، **چاپدانی** ساگرؔ چاپدانوی، فیاضؔ انور، **ایٹا گڑھ** عابدؔ شاہ آبادی، انجمؔ، جوہرؔ غازیپوری، نٹ کھٹؔ، اخترؔ ٹیٹا گڑھی۔ **مارواڑی کل** ارشدؔ اعظمی انوار الحسینی جامیؔ۔ **گھسڑی** ایمانؔ اعظمی، **رشڑا** رضاؔ جونپوری، زمانؔ اعظمی احسن مفتاحی۔ **بج بج** رازؔ جونپوری امینؔ الہ آبادی۔ حافظ رحمتؔ لکھنوی۔

ہمارے اردو شعرا غزل سے خاص شغف رکھتے ہیں، مگر نظم کی جانب بھی توجہ دی گئی ہے۔ جن شعرا نے نظم کو صنف شاعری کی حیثیت سے، باضابطہ اپنایا ہے اور فنی لوازمات کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے، ان میں سالکؔ لکھنوی، مضطرؔ حیدری، پروفیسر عبدالرؤف، علقمہ شبلیؔ، قیصرؔ شمیم، ظفرؔ اوگانوی نظام الدین نظامؔ، واحدؔ آروی قابل تحسین ہیں۔ سعیدؔ قدرت اور وحید عرشیؔ نے بھی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ کمال جعفریؔ، مسعودؔ عابدی اور شمیم انورؔ نے بھی، اس جانب توجہ مبذول کی ہے۔ علامہ جمیلؔ مظہری نے "آب وسراب" کی شکل میں، ایک قابل قدر مثنوی دی ہے۔ ڈاکٹر رضی ناطقیؔ نے قطعات اور رباعیات کی دنیا میں، خوشگوار اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے بنگال کے ذی قدر شاعر و ادیب کے متعلق "قطعاتِ تاریخ" کہے ہیں۔ اگر یہ قطعات، مجموعہ کی شکل میں، شائع ہو جائیں تو، عمدہ کام ہوگا۔ **گیت**

گیت کی اپنی مخصوص زبان ہوتی ہے۔ اس کے لئے دیہات کا ماحول مناسب ہے۔ غرض یہ کہ دیہات کی فضا ہی، اس کے لئے سازگار ہے۔ جس طرح "سمندر" کو "آگ" ــــ بنگال کی مروجہ زبان "بنگلہ" ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بنگال میں اردو گیت کی صنف کو اطمینان بخش ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ گرچہ مغربی بنگال میں "گیت" کی طرف مجموعی طور پر توجہ نہیں رہی۔ مگر انفرادی طور پر کچھ شعرا نے توجہ مبذول کی۔ مگر وہ بھی راہ میں تھک کے بیٹھ گئے۔ اور دوسری صنف شعر کی طرف متوجہ ہوگئے جن میں ...

جن میں اسحاق امرتسری، قیصر شمیم اور سوز سکندر پوری کے نام قابل ذکر ہیں ـــــ قیصر شمیم نے ایک طویل عرصہ تک اس جانب توجہ دی۔ اور اپنے خیال و فکر کی چاشنی سے، اس فن کو جلا بخشا ۔ ان کے پاس گیت کا جو ذخیرہ ہے ۔ اگر وہ کتابی شکل میں شائع ہو جائے تو "گیت" کے خزانے میں، بلاشبہ اہم اضافہ ہوگا۔ نوجوان شعراء میں اشرف غازیپوری نے چند اچھے گیت کی تخلیق کی ہے۔ مستقبل میں، ان سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔



حافظ فاضل الحق مظہری

شعری مجموعے

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
دیوان ریختہ	مظہر علی ولا	۱۸۰۱ء	دیوان ریختہ	قاضی محمد صادق اختر	؟
دیوان حیدری	سید محمد حیدر بخش حیدری	۶-۱۸۰۵ء	دفتر بے مثال	عبد الغفور نساخ	؟
دیوان افسوس	میر شیر علی افسوس	۱۸۰۲ء	دیوان مسکین	مسکین	مئی ۱۸۹۷ء
دیوان وحشت	رضا علی وحشت	۱۹۱۰ء	دیوان صادق	صادق	۱۹۲۸ء
دیوان جہاں	بینی نارائن	۱۸۱۲ء	دیوان شائق	خواجہ فیض الدین شائق	۱۹۰۸ء
مثنوی شرف	شرف النساء	۱۸۳۸ء	خمخانۂ بدر	امیر حسن بدر	۱۳۴۶ھ
دیوان اوحد	عبد الودود اوحد	۱۸۳۸ء	رباعیات شہباز	پروفیسر عبد الغفور شہباز	۱۹۴۲ء
دیوان آزاد	نواب سید محمد آزاد	۱۸۰۹ء	دیوان شمس	ابو القاسم شمس	" "
زلف خوباں	" "	۱۸۱۱ء	دیوان عزیز	عبد العزیز	" .
دیوان ضیغم	حافظ اکرام ضیغم	۱۸۸۹ء	ترانۂ وحشت	رضا علی وحشت	۱۹۵۳ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
دیوان اکمل	اکمل علی اکمل	۱۹۴۴ء	رنگ و بو	خرد غوث پوری	۱۹۶۳ء
دیوان سرور	سرور خاں سرور	؟	منارۂ نور	نظام الدین نظام	۱۹۶۵ء
دیوان نشتر	عبدالکریم نشتر		سیل اشک	اشک امرتسری	۱۹۶۵ء
نقش جمیل	جمیل مظہری	۱۹۵۳ء	نقوش رنگیں	——	——
دیوان خمار	مہ جبیں خمار		الہام سحر	آرزو سہارنپوری	۱۹۶۶ء
دیوان راحت	راحت آرا بیگم	۱۹۱۰-۴۹ء	نقش بقا	برہان الدین بقا نظامی	״ ״
مثنوی شرف النساء	شرف النساء مرشدآبادی		طوفان غم	رابعہ سلطانہ ناشاد	״ ״
مشام روح	تابان القادری	۱۹۵۱ء	جام جم	مضطر حیدری	״ ״
چشم غزال	فضل کریم فضل	۱۹۵۳ء	نے و نغمہ	آرزو سہارنپوری	۱۹۶۸ء
پریخانہ الفت	طاہر علی شاکر کلکتوی	۱۹۵۵ء	غالب سرائی	سید لطیف الرحمان	۱۹۶۶ء
فریاد و جواب فریاد	جوان سندیلوی	۱۹۵۷ء	لفظوں کی لکیریں	غلام حسین ایاز	۱۹۷۵ء
اجالوں کے گیت	سید حرمت الاکرام	״ ״	مصحف دل	ساجد ابروی	۱۹۷۰ء
شاہکار قصیدے	شاکر کلکتوی	״ ״	ساعتوں کا سمندر	قیصر شمیم	۱۹۷۱ء
نقوش جاوداں	مرتب سلیمان ڈوپلے	״ ״	آوارہ جبیں	مغموم کلکتوی	״ ״
طلوع سحر	نواب دہلوی	״ ״	کیف و اضطراب	سید لطیف الرحمن	۱۹۷۲ء
تذکرہ حبیب	حافظ کرامت الرحمن لکھنوی	۱۹۵۸ء	دائرہ در دائرہ	رونق نعیم	۱۹۷۲ء
ساز شکستہ	نازنین بیگم شکستہ	۱۹۶۳ء	شام و سحر	حاتی کلکتوی	۱۹۷۳ء
تیر و ترکش	سوز سکندرپوری	۱۹۵۹ء	زخم صدا	اعجاز افضل	۱۹۷۴ء
نکہت و نغمہ	سید ناظر الحسینی	״ ״	اجنبی خدا	شمیم انور	۱۹۷۴ء
ناسور	رابعہ سلطانہ ناشاد	۱۹۶۱ء	اپیل	واحد آروی	۱۹۷۵ء
شعلہ رنگیں	جرم محمد آبادی	۱۹۶۲ء	حرف و صوت/بے چہرہ لمحے	علقمہ شبلی	۱۹۷۵ء

اردو نثر ...



سیّد لطیف الرحمٰن

اُردو نثر

مغربی بنگال میں "اردو نثر" کی جو خدمت، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ذریعہ انجام دی گئی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد، اگرچہ یہاں تذکرے، ناول اور افسانے وانشائیہ وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ مگر وہ تشفی بخش نہیں کہے جا سکتے۔ آزادی کے بعد تحقیق و تنقید کے ساتھ "فن ترجمہ" کی جانب بھی توجہ دی گئی۔ جس کو صحافت نے جلا بخشی۔ مختصر افسانہ بھی خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ لیکن تنقید نے کوئی خاص ترقی نہیں کی، ہاں تحقیق کے دائرے کو وسعت ضرور ملی ہے ۔۔۔

تنقید | عبدالقیوم حسرت نعمانی اور نیاز احمد خاں کی ابتدائی کوششیں قابل قدر ہیں۔ نیاز احمد خاں کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" شائع ہو چکا ہے۔ علامہ وحشت، ہجو نے بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید نہال، پروفیسر رؤف، آغا رشید مرزا اور ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ رضی ناطقی، شریف آرزو، ظہیر ناشاد اور معین اعجاز نے بھی تنقید کی جانب، توجہ مبذول کی ہے اور راقم الحروف نے تنقید کو بطور فن کے اپنایا ہے۔

تحقیق کا سفر | مغربی بنگال میں اردو تحقیق کے سفر کی ابتدا کب ہوئی؟ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد، یہاں کا ادبی رجحان شاعری کی دنیا میں قید ہو کے رہ گیا تھا۔ مگر موجودہ تحقیق کی روشنی میں، بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں تحقیق کا جذبہ، ناسخ اور راسخ کے دور میں ہی، ابھرنے لگا تھا۔ ناسخ کا تذکرہ "سخن شعرا" (سنہ ۱۲۹۱ھ) اور نسخۂ دلکشا (سنہ ء) جو جنم جے مترا کے زور قلم کا نتیجہ ہے، ان تذکروں میں تحقیق کے خد و خال ملتے ہیں سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد وفا راشدی نے "بنگال میں اردو" (سنہ ۱۹۵۴ء) شائع کی۔ بعد کے محققین ہیں۔ **سید لطیف الرحمٰن**۔ سید لطیف الرحمٰن، وفا راشدی کے بعد تحقیق نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ان کی کتاب "ناسخ سے وحشت تک" (۱۹۵۹ء) شائع ہوئی اور مقبول بھی ہوئی "غالب اور ان کے معترضین" حال میں شائع ہوئی ہے۔ **ڈاکٹر جاوید نہال**۔ جاوید نہال نے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے

اور ترقی پسند ...

اور ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی، خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں، شاعری بھی کی ہے ان کی کتاب "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" (۱۹۶۹ء) شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک کا ادبی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے بنگال میں، جدید سائنٹفک اردو تحقیق کو رواج دینے میں، اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔



شانتی رنجن بھٹاچاریہ

شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ شانتی رنجن، بنگال کے معروف محقق ہیں۔ انہوں نے "اردو اور بنگال" "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" اور "آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو" لکھی۔ یہ تینوں کتابیں بنگال اور اردو کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں۔ "بنگال میں اردو زبان و ادب" "اردو اور بنگالی کلچر" "خواتین میں بنگال کی اردو خدمات" عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ شاہ مقبول احمد۔ پروفیسر شاہ، تحقیق و تنقید سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین "چند ادبی مسائل" کے نام سے شائع ہو کر، سرمۂ اہل نظر بن چکے ہیں۔ اس مجموعے کے وہ مضامین، جو لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اردو زبان کے ارتقا اور اس کی ترقی کے زینوں کو نئے انداز سے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ـــــ مگہی، میتھلی اور بھوجپوری کے مسلم شعراء کا وہ تحقیقی زاویۂ نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور "تاریخ ادب اردو" لکھنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔ امیر رضا کاظمی۔ رضا کاظمی، بزرگ نثر نگار ہیں۔ انہوں نے قابل قدر مضامین لکھے ہیں۔ اور اردو نثر کی ترقی میں، اہم کردار ادا کیا ہے پروفیسر مسعود حسن۔ پروفیسر حسن۔ بزرگ ادیب ہیں۔ انہوں نے متعدد علمی و ادبی مضامین لکھے ہیں، جو ملک کے معیاری ادبی رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ آپ کے مضامین اردو اور انگریزی کے قابل قدر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کے۔ ایم۔ یوسف۔ خواجہ یوسف (ایڈوکیٹ)، سماجی ادیب کی حیثیت سے، خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں کے مقبول ادیب ہیں۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی اکثر اخبارات و رسائل کی زینت

بنتے رہتے ....



وکیل احمد صدیقی

بنتے رہتے ہیں۔ **پروفیسر رؤف**۔ پروفیسر عبدالرؤف کو بھی اردو تحقیق سے گہری دلچسپی ہے۔ پروفیسر رؤف کو کلکتہ یونیورسٹی نے پہلی مرتبہ ان کے تحقیقی مقالہ "میر باقر مخلص مرشد آبادی" پر ڈی۔لٹ کی ڈگری دی ہے۔ مظہر الحق شاہ عرف پیارے شاہ صاحب کی کتاب کو انہوں نے ترتیب دیکر "اسرار تصوف" کے نام سے، شائع کیا ہے۔ "وحشت کا تنقیدی شعور" "غالب اور سرسید" "بیان غالب کا ایک پہلو" "اردو میں پرتگالی الفاظ" اور "بیخود مرحوم پر" ان کا مضمون معلومات افزا ہے۔ **ظفر اوگانوی** ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے بھی اردو ادب کو چند اچھے تحقیقی و تنقیدی مضامین دیئے ہیں۔ صغیر بلگرامی کے تذکرہ "جلوۂ خضر" کو "جلوۂ خضر تلخیص و تنقید" کے نام سے انہوں نے ترتیب دیکر، شائع کیا ہے۔ **ملک عبدالحلیم**۔ ملک عبدالحلیم گیاوی، کلکتہ کے اچھے خوشنویس اور ادیب تھے۔ ان کی کتاب "تاریخ ملک" جس میں صوبہ بہار کے ملک کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ "دُرِّ بے بہا" کے نام سے "منتخب حدیث" کو بھی، انہوں نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر رضی ناطقی، راقم السطور، سید الابرار، حکیم کمال احمد اظہر ناشاد، حامد شمسی، شمس آزماں، راز عظیم، قمر جلالی کے علاوہ انجم نعیم، مسعود عابدی، وکیل احمد صدیقی، رعنا اشفاق، طیبہ صدیقی، معین اعجاز اور مشتاق احمد کے یہاں بھی تحقیقی کاوشیں ملتی ہیں۔ **وکیل احمد صدیقی**۔ نئے لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین، ادبی اخبارات و رسائل میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ **رعنا اشفاق**۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں، غالباً یہ پہلی خاتون ہیں، جنہوں نے آزادی کے بعد بنگال میں، باضابطہ تحقیق و تنقید کی جانب، توجہ مبذول کی ہے۔ **طیبہ صدیقی**۔ پروفیسر فخر الدین صدیقی اثر کی صاحبزادی ہیں۔ ان کے علمی و ادبی مضامین، اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ صفیہ پروین، امرا مبری، ابوبکر جیلانی، محمد صالح کے یہاں بھی تحقیق

کا جذبہ پروان ...

کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی کے تقریباً اٹھارہ طلبار قابل قدر اساتذہ، ڈاکٹر عطا کریم برق، ڈاکٹر جاوید نہال، پروفیسر عبدالرؤف اور ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی زیر نگرانی، مختلف موضوعات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ بعض طلبار کو کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے ریسرچ اسکالر شپ بھی دی گئی ہے۔ ریسرچ کیلئے جو موضوعات دیئے ہیں۔ ان میں سے چند اہم موضوعات یہ ہیں: کاظم علی جوانؔ (سجاد نظر) قدرت اللہ قدرتؔ (کامل اختر) نواب سید محمد آزادؔ (اشتاق احمد) نذیر احمد بحیثیت صناع ادب (وحید عرشی) مغربی بنگال میں اردو افسانے (ایم۔ اے۔ نصر) دبستان وحشتؔ (راز عظیم) میر امن دلی والے کی نثری خدمات (عبدالمنان) اردو نظم نگاری میں نئے رجحانات (یوسف تقی) مظہر علی ولا (نصرت جمیل) آزادی کے بعد بنگال میں جدید اردو شاعری (حیدر حسن کاظمی)۔



ڈاکٹر عطا کریم برق

علمی و ادبی اور تنقیدی و تحقیقی کتابیں

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
اردو محاورات	مرزا جان طپش	۱۸۱۱ء	معتوب بے بال وپری	معین اعجاز	
نسخۂ دلکشا	جنم جے مترا		منزل کہاں	مرتب شمیم اقبال	
	راجہ جنم جے مترا ارمان	۱۸۶۰ء	مکاتیب وحشت	مرتب الحاج شمس الدین عازم	۱۹۵۶ء
تذکرہ سخن شعرا	عبدالغفور خاں نساخ	۱۸۷۵ء	آنسو ہی آنسو	محبوب انور	
تذکرۃ المعاصرین	" " "		آئینہ بکور	از منی لال جوان	۱۹۵۷ء
مقالات وحشت	رضا علی وحشت		میر کارواں	ناظر الحسینی	۱۹۵۸ء
			نساخ سے وحشت تک	سید لطیف الرحمٰن	۱۹۵۹ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
ذکرِ آزاد	مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	۱۹۶۰ء	اردو اور بنگال	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۹۶۸ء
روسی فکر اور مفکر	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۹۶۲ء	چراغِ راہ	مرتب ایم۔ اے۔ نقر	۱۹۷۱ء
بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۹۶۲ء	اردو محاورے	مرتبہ فخرالدین صدیقی اثر	۱۹۷۲ء
ادبی تاثرات	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۹۶۵ء	بیسویں صدی میں بنگال کے اردو شعراء	مشتاق احمد	۱۹۷۲ء
انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب	جاوید نہال	۱۹۶۷ء	غالب اور ان کے معترضین	سید لطیف الرحمٰن	۱۹۷۳ء
مثنوی رانی رنجیت ربھا	مرتب امرا امیری		جلوۂ خضر	ظفر اوگانوی	۱۹۷۳ء

مختصر افسانے

بنگال میں اردو افسانے کا رواج باقاعدہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔ لیکن اس سے قبل عبدالحلیم شرر، سہیل عظیم آبادی، قاضی عبدالغفار[1]، سدرشن[2]، اختر حسین رائے پوری[3]، شین مظفرپوری، ضیا عظیم آبادی کا بنگال سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ بعد میں وہ یہاں سے چلے گئے، مگر یہاں انہوں نے جو تخلیقی کام کئے ہیں وہ بلا شبہ اردو ادب کے لئے بیش بہا ہیں۔ اور ان کی موجودگی، بنگال کے خوبصورت ماضی کی یاد کو تازگی دیتی ہے، شریف چکوالی، یوسف اختر، سالک لکھنوی، یونس احمر، نشاط الایمان، خلیل الرحمٰن لکھنوی، محمد صابر خاں ضبط، مہدی رضوی، محمد طیب، ابوالخیر محمد فاروق، سعد منیر، شاہ مقبول احمد، منظور، کلام حیدری، افسر ماہ پوری، شہزادہ منظر، اسحاق امرتسری اور جوہر غازیپوری نے خونِ جگر سے، افسانوی ادب کے پودے کو سینچا۔ صابر خاں ضبط ۔ ڈاکٹر محمد صابر خاں ضبط نے تین مضامین اسلامک ہسٹری کلچر، عربی و فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اور تینوں میں فرسٹ کلاس ہیں۔ باہر کی یونیورسٹی نے مشہور

---

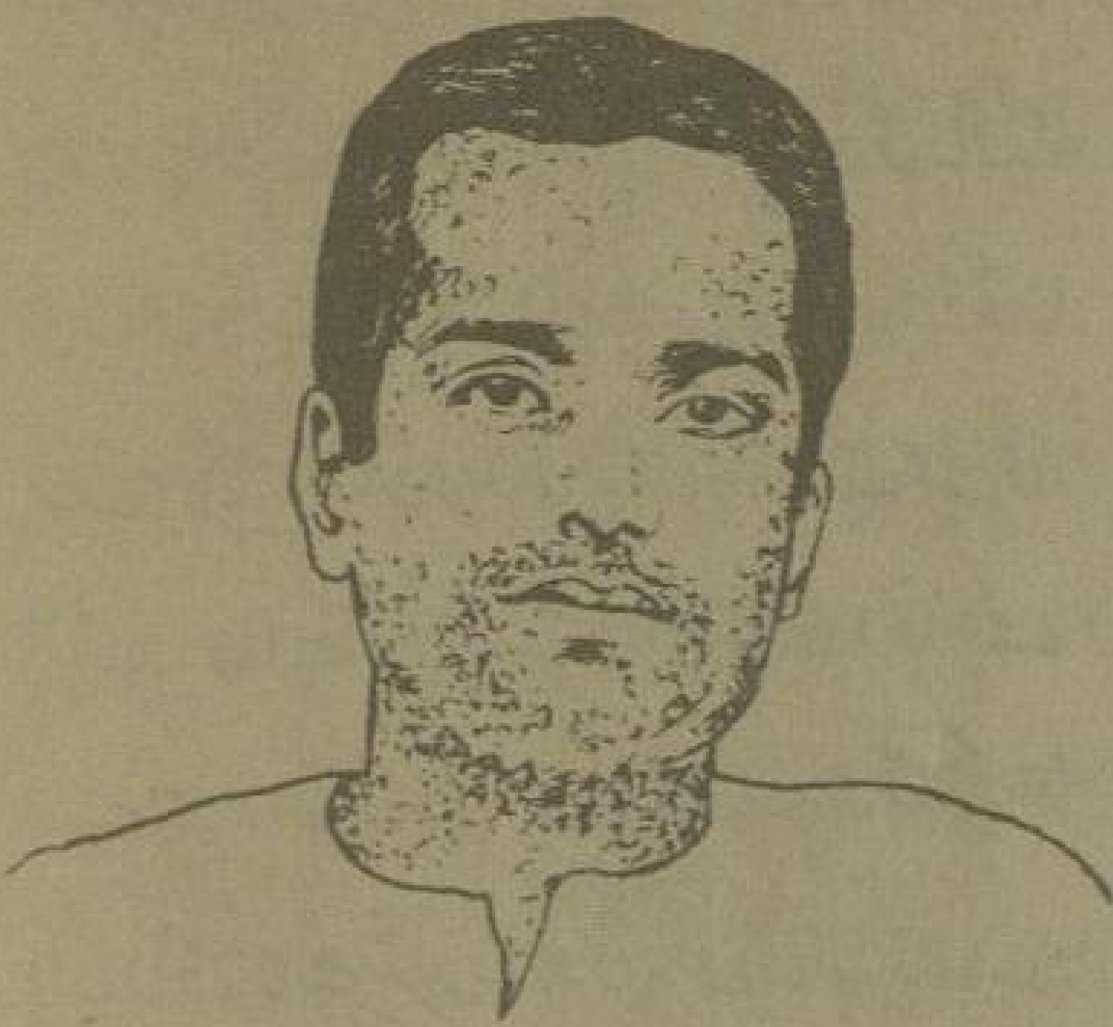
[1] قاضی عبدالغفار کی زندگی کا طویل عرصہ کلکتہ میں گذرا ہے۔ وہ رسالہ جمہور کلکتہ کے پبلشر تھے جس کے ایڈیٹر کبھی چڑیا کوٹی تھے۔ [2] سالک لکھنوی کا کہنا ہے کہ وہ بڑا بازار (کلکتہ) میں، بہت دنوں تک رہے۔ [3] اختر، روزنامہ ہند (کلکتہ) سے بہت دنوں تک وابستہ رہے۔

فلاسفر، مفکر اور مؤرخ "میسکوے" MISCOWY پر عالمانہ کام کے صلہ میں انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ اس وقت بنگال کے یہ زبردست عالم و دانشور، پبلک سروس کمیشن (مغربی بنگال) کے ایک ممبر کی حیثیت سے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی بھی اردو شاعری اور افسانہ نگاری سے شروع ہوئی۔ ان کی کہانیاں، ادب لطیف لاہور، جادہ بھوپال اور گرانقدر مضامین غیر ملکی معیاری و مقتدر جریدوں (انگلش) میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔



یوسف اختر

سالک لکھنوی ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے، خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "عذرا اور دیگر افسانے" سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا جس میں دو طبع زاد افسانے "عذرا" اور "صندوق" شامل ہیں۔ اور دو افسانے موپاساں کے افسانے کا ترجمہ ہیں، جو "چاندنی رات میں" اور "قومی غیرت" کے عنوان سے، اس مجموعہ میں، شامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ،صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے سرورق پر غالباً گجن بائی کی تصویر ہے۔ اور سالک لکھنوی کا نام، اس مجموعہ میں مؤلف و مترجم کی حیثیت سے شامل ہے۔ ان کے دو مختصر افسانے "اچھوت" اور "بوڑھا کسان" بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کے متعلق سالک لکھنوی کا دعویٰ ہے کہ وہ بنگال میں لکھے گئے اردو کے مختصر ترین افسانے ہیں۔ **یوسف اختر**۔ ایم۔ ڈی اختر ثانی اور محمد یوسف اختر کے قلمی نام ہے۔ افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔ کامران اختر کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ آپ یونس احمر کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی صلاحیتیں، گوشہ تنہائی کی نذر ہو گئی ہیں۔ **شاہ مقبول احمد**۔ شاہ مقبول احمد نے متعدد افسانے لکھے ہیں۔ جن میں "تبدیلی" "جوڑے کی تلاش" اور "زیور" موضوع کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہیں اور افسانہ "شاہ صاحب" بھی۔ جس کو پرویز شاہدی نے "جدید اردو" میں "حق شناس" کے عنوان سے شائع کیا تھا، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ **یونس احمر**۔ ترجمہ نگار، شاعر اور افسانہ نویس کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ "سنگریزے" (۱۹۴۴ء) کے مرتبین میں، احمر کا نام بھی شامل ہے۔ احمر، نشاط اور خلیل کے افسانے



نشاط الایمان

اس مجموعہ میں، شامل ہیں، جو ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نشاط الایمان ترقی پسند افسانہ نگاروں میں، بلند مقام رکھتے ہیں۔ خاموش پسند طبیعت پائی ہے اس وجہ سے نئے ناقدوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ مگر بنگال کی ادبی تاریخ کا مطالعہ، گہری نظر سے جو بھی کرے گا، وہ ان کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پائے گا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "لیل و نہار" شائع ہوچکا ہے۔ جو ترقی پسند افسانوی مجموعوں میں، نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جاوید نہال۔ جاوید نہال نے بنگال میں اردو افسانے کی ترویج و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ "پھول رانی" ترقی پسند اردو افسانہ میں، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں، ان کے اسلوب میں، تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب وہ ترقی پسند جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی، نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اردو افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "چوٹی" بہت مشہور ہوا ہے۔ جس کے بارے میں، ان کا دعویٰ ہے کہ بنگال میں لکھا گیا وہ سب سے پہلا مختصر ترین افسانہ ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ "راہ کا کانٹا" شائع ہوچکا ہے۔

آزادی کے بعد افسانہ نگاری بنگال بالخصوص کلکتے میں اور بھی مقبول صنف بنی۔ راشد القادری، جاوید نہال، ادیب سہیل، احمد سعدی، قیصر شمیم، شمس صابری، سعد منیری، زین العابدین اور محمود ایوبی، کئی اچھے افسانہ نگار ابھرے، صادق اور سعدی (مشرقی پاکستان) بنگلہ دیش چلے گئے۔ جاوید نہال، یہاں رہ گئے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں۔ افسانہ نگاروں کی نئی پود ابھری۔ ان میں قیصر نشاط نے نشاط الایمان کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ سجاد نظر نے بھی "افکار" اور دوسرے رسالوں میں اچھی کہانیاں لکھیں۔ نکہت ایم اے بی ٹی نے بھی، بیسویں صدی (دہلی) میں کئی اچھے افسانے لکھے۔ قیصر شمیم اور ناظم سلطانپوری نے بھی عمدہ کہانیاں دیں۔ مگر بعد میں وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جان عالم سیف، انور اعظم اور سعید پریمی نے بھی، اردو دنیا کو اچھے افسانے دیئے ہیں۔ اس کے بعد بھی، کئی اچھے افسانہ

نگاروں ...

نگاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ جن کی فنکارانہ صلاحیت کو دیکھتے ہوئے یہ رائے دی جا سکتی ہے کہ وہ بنگال میں افسانوی ادب کو ترقی دینے میں معاون ثابت ہوں گے۔ جن میں شاہدہ حسن، جوہر غازیپوری، ساگر جاپانوی، انیس رفیع، تسکین انصاری، مشتاق اعظمی، اظہار الاسلام، بلیغ آسنولوی، شمس ندیم، عابد ضمیر، قیام انیس، فیروز عابد، وفا سکندر پوری، سید الابرار، نصرت جمیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ گذشتہ برسوں میں جو افسانہ نویس ابھر کے سامنے آئے ہیں۔



ظفر اوگانوی

ان میں انجم نعیم، خورشید شیدائی، عشرت بیتاب، جلیل عشرت، غلام معین، سجاد قمر، امر امیری، امین اشرف، حشمت خضر پوری، نوید ہاشمی، نظام الدین، اصغر شریف، نور تبکیر، عباس علی، ع.م حمیدی، امین قاضی، محمد شمس الحسن انصاری، عابد عباسی بسمل رضا، حبیب الرحمن جوہر، اور عیسیٰ سنجر کے نام نمایاں ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ابتدا میں افسانے لکھے ہیں۔ جو ملک کے معروف رسالوں میں شائع ہوئے ـــــ افسانہ "ہنستے زخم" افسانوی مجموعہ "گلکدہ" (مرتب جلیس سہسوانی) میں شامل ہے۔

ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی شخصیت، جدید افسانوی ادب میں روز روشن کی طرح عیاں ہے بیسویں صدی (دہلی) میں ان کے جو افسانے شائع ہوئے ہیں۔ وہ انہیں رومانی افسانہ نگاروں کی فہرست میں، اعلیٰ مقام کا حقدار ٹھہراتے ہیں۔ ڈاکٹر اوگانوی کے کلکتے میں مستقل طور پر منتقل ہو جانے کے بعد، بنگال بالخصوص کلکتے میں جدید افسانے بھی مقبول ہوئے۔ نئی نسل کے ساتھ بزرگ افسانہ نگاروں کے لہجے میں بھی تبدیلی آئی۔ حتیٰ کہ بنگال کے ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار ڈاکٹر جاوید نہال کے ہاں بھی، یہ تبدیلی نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں جدید اسلوب نے ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ شاہدہ حسن، انیس رفیع، قیام انیس، تسکین، سجاد اور عابد نے بھی نئے رنگ کو اپنایا ہے۔ شاہدہ حسن بنگال کی مقبول خاتون افسانہ نویس ہیں، انہوں نے کم مدت میں، ہندوستان گیر شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے افسانے، ملک کے معیاری ادبی رسالوں میں اکثر شائع

ہوتے ...



قیام آنیس

ہوتے رہتے ہیں۔ قیام آنیس اچھے افسانہ نویس اور مخلص انسان ہیں۔ ان کے افسانے، اکثر و بیشتر ادبی اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ مشتاق اعظمی مشتاق اعظمی بحیثیت رومانی افسانہ نگار، نمایاں مقام رکھتے ہیں انہوں نے بچوں کے لئے بھی، اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے دوش بدوش نئی نسل کے افسانہ نویس بھی اردو افسانے کے خاکے میں، نئے و پرجاذب رنگ بھرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔

افسانوی مجموعے

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
بانسری کی آواز	راحت آرا بیگم	بم-۱۹۱۰ء	شاہکار افسانے	اشک امرتسری	
شب کی پکار	"	" "	بہتے آنسو	علی افسر	۱۹۵۸ء
بدر کی بیٹی / دلنواز	"	" "	ملاحظات نفسی	ل۔ احمد اکبر آبادی	۱۹۵۹ء
انقلاب / غنچۂ افسانہ	"	" "	راہ کا کانٹا	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۹۶۰ء
عذرا اور دیگر افسانے	سالک لکھنوی	۱۹۴۱ء	شاعر کی شادی	" " "	۱۹۶۱ء
سنگریزے	احمر۔ نشاط۔ خلیل	۱۹۴۴ء	پھول رانی	جاوید نہال	۱۹۶۱ء
گلابی تارے	ساجن پردیسی	۱۹۴۵ء	زندگی کے کھیل۔۔	ل احمد اکبر آبادی	۱۹۶۵ء
عورت کا انتقام	محمد سلیمان واصف		صبح و شام	"	۱۹۶۶ء
ٹیلی فون گرل	کرم چند	۱۹۵۶ء	لیل و نہار	نشاط الایمان	۱۹۶۸ء
نیا شاہکار	صالحہ بیگم مخفی	۱۹۵۶ء	دھند اور کرن	شمس صابری	۱۹۷۳ء
باغیانے افسانے	جوہر غازی پوری	۱۹۵۷ء	سلگتی چاندنی	روحی انعام	۱۹۷۴ء

ناول ...

ناول اور ڈرامے



جان عالم سیف

ناول اور ڈرامے کے فن کو یہاں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ عبدالحلیم شرر، قاضی عبدالغفار، ضیاء عظیم آبادی، خواجہ عتیق اللہ، خواجہ محمد اشرف، خواجہ محمد اعظم، راحت آرا بیگم نے بنگال میں ناول کی صنف کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس صنف کو یہاں، قبولیت کا درجہ دلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ بی ایچ سرشار اور سجاد نظر نے بھی اس طرف توجہ دی۔ جان عالم سیف سیف نے افسانوی لہجہ پایا ہے۔ انہوں نے دو خوبصورت ناول "آخری شکست" اور "روپ متی" کی تخلیق کی اور بلاشبہ، یہ دو ناول، اردو کے اچھے ناولوں کے مقابل میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یہ دونوں ناول شائع ہوکر مقبول انام ہوچکے ہیں۔ روحی انعام اچھی افسانہ نگار اور ناول نویس خاتون ہیں۔ "سلگتی چاندنی" ان کا مشہور ناول ہے۔ بشیرالدین ظاقی۔ ظاقی، ابھرتے ہوئے، ناول نگار ہیں، ان کا ناول "کھنور" شائع ہوچکا ہے۔

بنگال کی یہ خوش قسمتی تھی کہ آغا حشر کاشمیری نے ایک طویل عرصہ تک، یہاں قیام کیا۔ مگر ڈرامے کے فن کو پھر بھی، یہاں ترقی نصیب نہیں ہوئی، نیاز احمد خاں اور خلیل الرحمٰن خلیق نے ڈرامے لکھے اور ان کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے، مگر ماسوا "یہودی کی لڑکی" اور "خوبصورت بلا" (آغا حشر کاشمیری) کے یہاں کوئی بھی ڈرامہ، کتابی شکل میں شائع نہ ہوسکا۔ جلیل چاند پوری۔ جلیل احمد چاند پوری، اچھے شاعر اور ڈرامہ نویس ہیں۔ انہوں نے کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں اکثر بچوں کے لئے ہوتے ہیں۔ "چوہا اور لڑکا" ان کا مشہور ڈرامہ ہے، جو کارپوریشن اسکول کی جانب سے اسٹیج بھی ہوچکا ہے۔ کمال احمد نے بھی، کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں، جو اسٹیج ہوچکے ہیں۔ محبوب انور، نہ صرف مشہور شاعر و ادیب ہیں بلکہ کامیاب ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ انہوں نے کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں جو اسٹیج بھی ہوچکے ہیں۔ بنگال میں فن ڈرامہ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ناول ...

ناول

کتاب	مصنف	سن اشاعت
عبرت	خواجہ عتیق اللہ	۱۹۴۲ء
دیوی چودھرائن	"	"
خدا کی شان	"	"
خوبیٔ قسمت	خواجہ محمد اشرف	"
بڑی بہو	خواجہ محمد اعظم	"
زنجیر محبت	محمد سلیمان واصف	
پریمی	راحت آرا بیگم	
فیروزہ	جمیلہ بیگم	
روشنک بیگم	محمودہ بیگم	
خون جگر ہونے تک	فضل احمد کریم فضلی	
سرلا	بیگم مرزا احمد علی	۱۹۶۰ء
پھول بنے انگارے	سجاد نظر	۱۹۶۰ء
روپ متی	جان عالم سیف	۱۹۶۱ء
پیاسے دل	ابراہیم اختر	۱۹۶۲ء



روحی انعام

کتاب	مصنف	سن اشاعت
خواب پریشاں	بی۔ ایچ۔ سرشار	
موت کا سایہ	صغریٰ بیگم سبزواری	۱۹۷۱ء
دیا جلے آدھی رات	رشید انقلابی	
سلگتی چاندنی	روحی انعام	
شہر توران	ایم۔ رفیق	۱۹۷۳ء
کھنور	بشیر الدین ظامی	۱۹۷۵ء

ڈرامے

کتاب	مصنف	سن اشاعت
جولیس سیزر	محمد سلیمان واصف	
جنگ روس و تاتار	"	
نادر شاہ	"	
خیر و شر	وحید النبی	

کتاب	مصنف	سن اشاعت
رادھا ناٹک	راحت آرا بیگم	۱۸۲۸ء تا ۱۸۸۰ء
یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری	۱۹۵۵ء
خوبصورت بلا	"	

طنز و مزاح...



شاہ مقبول احمد

طنز و مزاح طنز و مزاح کے فن کو بھی یہاں کوئی خاص ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ **پروفیسر شاہ مقبول احمد** پروفیسر موصوف نے ابتدا میں اس طرف توجہ دی تھی۔ اس طرح یہاں "میاں اچھن کمرہ نمبر ۵۶" اور "حماقتیں" کی تخلیق ہوئی۔ مگر مزاح کے فن کی یہ بدقسمتی تھی کہ پروفیسر موصوف نے جلد ہی تحقیق و تنقید کی جانب توجہ مبذول کر دی۔

سالک لکھنوی۔ شمیم ریاض کپور، سالک لکھنوی، اچھے شاعر معزز ناقد اور نیک انسان ہیں۔ مگر ان کی منفرد اور بنیادی حیثیت "طنز و مزاح نگار" کی ہے۔ ان کا خود یہ خیال ہے کہ وہ شاعر کی بہ نسبت، بہتر نثر نگار ہیں ـــــ جہاں تک طنز نگاری کا تعلق ہے، سالک لکھنوی بلاشبہ کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے مقابل میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ان کا پہلا طنزیہ مضمون "چھوٹے ماموں" ۱۹۳۲ء میں، عصر جدید کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں، انہوں نے اپنے حقیقی ماموں کا قلمی خاکہ کھینچا تھا۔ اور معاوضے میں، ماں سے پٹے تھے۔ اس کے بعد وہ "دوسروں" کے بجائے "خود" اپنے اوپر طنز کرنے کے قائل ہو گئے۔ اور پھر یہ ان کا "نظریہ" بن گیا۔ سالک، اب بھی، اس نظریئے کو اپنے اوپر مسلط کئے ہوئے ہیں کہ بہتر طنز وہ ہے، جو دوسروں کے بجائے، خود اپنے اوپر کیا جائے۔ ثبوت کے طور پر "غالب اور میں" "اگر پٹنے کا جی چاہے" "یہ شعر کس کا ہے" "احوال غالب از کلام غالب" "میں شاعر کیسے بنا" پیش کئے جا سکتے ہیں ـــــ سالک کی طنزیہ تقریریں ـــــ "میری مشہور تقریر" (جسے سننے کا شرف کسی خوش نصیب کو حاصل نہیں ہوا) کے "عنوان" سے اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ان کے تعارفی مضامین [illegible] مطالعہ ہیں، جن میں، دلچسپ پیرائے میں، مشہور شاعر و ادیب کے "نقش و نگار" ابھارے گئے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے، سالک نے اردو کو ایک نیا اور مخصوص لہجہ دیا ہے۔ جس کو "طنزیہ" یا "مزاحیہ" کے بجائے "ظریفانہ" یا LIGHT HUMOUR کہنا زیادہ، مناسب ہے جن شاعر و ادیب کا "تعارف" سالک نے لکھا ہے ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی، سردار جعفری

سہیل ...



یونس احمر

سہیل عظیم آبادی، روشؔ صدیقی، سعید احمد اکبرآبادی، عباس علی خاں بیخودؔ، یونس احمر، مجاز لکھنوی، احسان دانش، ابراہیم ہوش، وغیرہم۔ سالک نے اپنا تعارف بھی دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔

سالک اپنے طنزیہ مضامین میں، جزوی باتوں کے بجائے "بنیادی باتوں" سے بحث کرتے ہیں۔ خواہ موضوع بحث کسی کی شخصیت ہو، سماج یا —— ادب کی کوئی صنف۔ وہ ترقی پسند ہونے کے ناتے "جدیدیت" کو "وحشی رجحان" تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں "جدید شاعری" پر کس انداز سے طنز کرتے ہیں۔[1]

"آج کا اردو ادب خاص طور پر شاعری جس منی اسکرٹ، پاپ پن پینٹ اور ہپی فیشن میں ملبوس ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے شعر میں معنی تلاش کرنا، ایک بے معنی سا سوال ——"

انہوں نے باضابطہ طور پر طنز و مزاح کے فن کو اپنایا ہے۔ اور اردو نثر کو ایک نئے اور دلکش انداز سے آشنا کیا ہے۔ وہ اپنا خاص اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کا طرز بیان تیکھا اور بھرپور ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں، فرضی ناموں سے بھی طنزیہ مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً معتبر انیچی، ملا عرفی، فارانی، گمنام وغیرہ سالک لکھنوی کے اگر طنزیہ مضامین، کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب کو ایک بلند پایہ طنز و مزاح نگار، مل جائیگا —— کنہیا اور فکر کے ساتھ سالک ملکر اردو طنز و مزاح کی دنیا میں "مثلث" بناتے ہیں۔ جس کو "طنزیہ مثلث" بھی کہا جا سکتا ہے۔

اردو شاعری میں "مزاح" کو کوئی خاص جگہ نہیں ملی۔ فضلی صدیقی۔ ہزل گو شعراء میں

---

[1] یہ شوکس کا ہے۔ مطبوعہ صبح نو، اکتوبر ۱۹۷۱ء

فضلی ...



آغا رشید مرزا

نفضلی صدیقی کا مرتبہ بلند ہے۔ صدیقی نے اس فن کو ترقی دینے کی سعی کی اور ان کی کوششوں سے "ہزل" کے دائرے کو یہاں وسعت ملی۔ چھیلا اعظمی، نٹ کھٹ کلکتوی اور اسٹیل وغیرہم نے بھی اس کی جانب توجہ صرف کی ہے ـــــ جاوید نہال، ملا رموزی، مصطفےٰ صابری، راقم لکھنوی، رئیس الدین فریدی نے بھی طنزیہ و مزاحیہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے ہیں مگر مستقل فن کی حیثیت سے، نہیں اپنایا۔ نئی نسل میں طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے، چند نئے نام سامنے آئے ہیں۔ جن میں حسن جمہور، رحمت جمال اور مسعود عابدی میں اچھے طنز و مزاح نگار بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

تشریحات

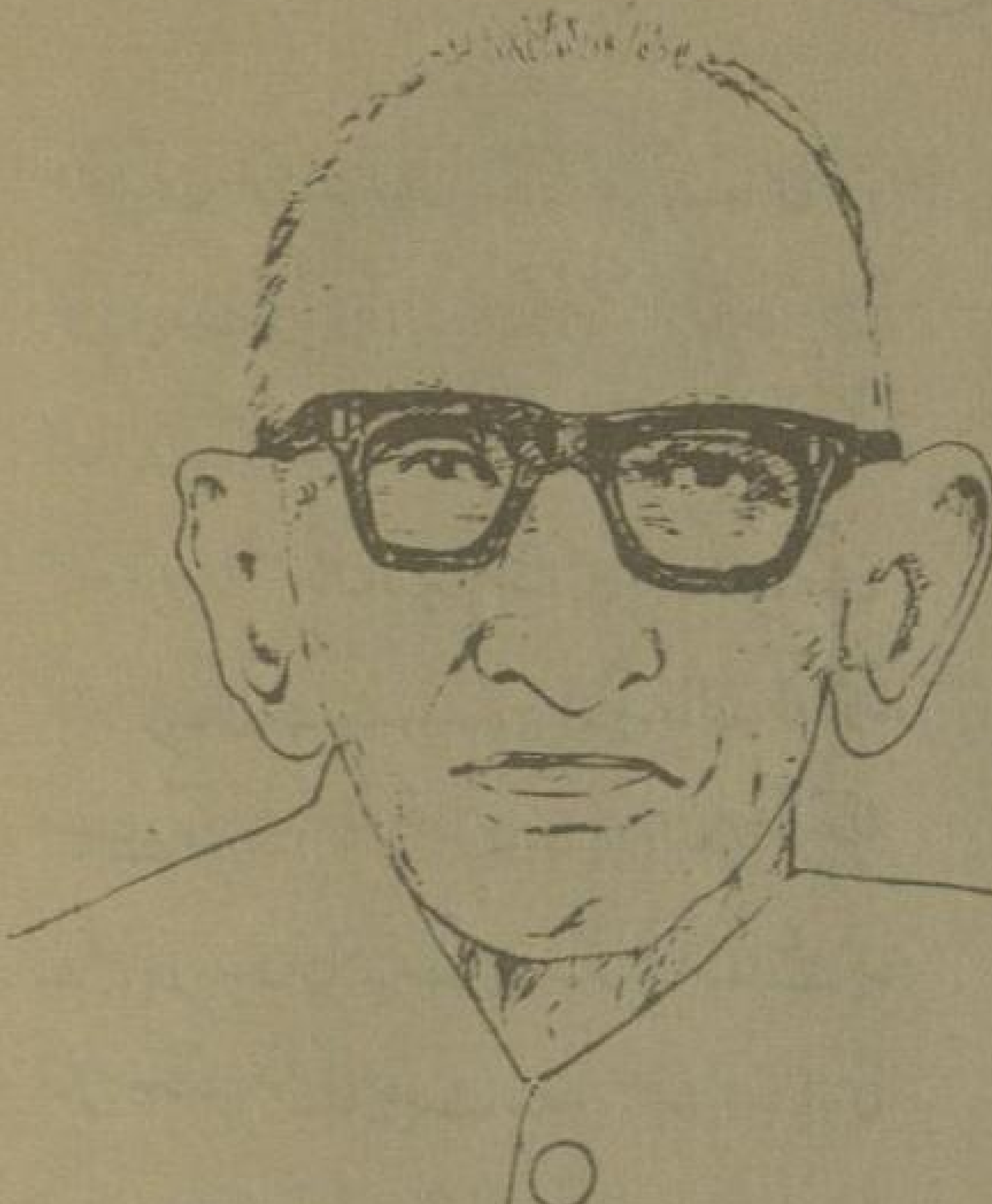
مغربی بنگال میں "تشریح" کی جانب، نظم طباطبائی کے بعد، باضابطہ طور پر سالک لکھنوی نے توجہ دی ہے۔ اور انہوں نے تشریح کے فن کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا۔ سالک لکھنوی نے ۵۲ اشعار کی تشریح "نئے انداز" سے کی ہے۔ برسوں پہلے، انہوں نے "آثار" (کلکتہ) میں "تشریح" کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اور ۲۹ اشعار کی تشریح نئے اور مخصوص انداز میں کی تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جب "شب خوں" میں "اشعار" کی تشریح کا سلسلہ شروع کیا، تو بہت حد تک سالک کے انداز کو اپنانے کی سعی کی مگر ـــــــــ۔

سالک نے ۲۹ اشعار کی تشریح کو کتابی شکل میں، شائع کرانے کی خواہش، سردار جعفری کے سامنے ظاہر کی، تو سردار نے اور ۱۲ شعرا کے اشعار کی تشریح کا مشورہ دیا ـــــ اور اب سالک ان ۱۲ شعرائے علاوہ ۱۱ نوجوان شعراء کے اشعار کی تشریح بھی، اس کتاب میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور یہ قابل ستائش فعل ہوگا، ساتھ ہی کتاب کی افادیت اور اہمیت میں زیادتی کا سبب بھی۔

ترجمہ نگاری

مغربی بنگال میں ترجمہ کا کام باضابطہ اور اجتماعی طور پر فورٹ ولیم کالج میں ہوا۔

فورٹ ولیم...:



ل۔احمد اکبر آبادی

فورٹ ولیم کے بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بے شمار علمی و ادبی کتابوں کا ترجمہ کیا اور پھر یہاں اردو ترجمہ کا کام ٹھپ پڑ گیا۔ بٹوارہ سے کچھ پہلے شریف جکوالی، افراہ پوری، سہیل واسطی اور سالک لکھنوی نے ترجمہ کی طرف توجہ دی۔ اور ان کی انفرادی کوششوں کی وجہ سے یہاں کچھ دنوں کے لئے خاموشی ٹوٹی ـــــ یونس احمر نے ترجمہ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اردو ادب میں بیش بہا نقش و نگار بنائے۔ ان کی ترجمہ نظمیں اور کہانیاں ملک کے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے قاضی نذرالاسلام کی دو کتابوں کا ترجمہ "زہریلی بانسری" اور "طغیان" کے عنوان سے کیا، جو بہت مقبول ہوئیں۔ احمر کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے بنگال میں اردو ترجمہ کا کام رک سا گیا ـــــ۔

آزادی کے بعد

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ترجمہ نگاروں میں مشہور و معروف ادیب ل احمد اکبر آبادی کا نام نمایاں ہے۔ ل۔ احمد۔ ل احمد اکبر آبادی نے مختلف زبانوں کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ جو اردو ادب میں یقیناً اضافہ ہیں۔ ان کے بعد امیر رضا کاظمی، جاوید نہال، نشاط الایمان، پروفیسر عبدالرؤف، ابراہیم ہوش، قیصر شمیم، رئیس الدین فریدی اور ناظر الحسینی نے ترجمہ کے چراغ کو روشن کیا۔ جاوید نہال نے موپاساں، گورکی چیخوف وغیرہ اور بنگالی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو اردو کا لباس دیا۔ امیر رضا کاظمی نے بھی ترجمہ کے کام کو آگے بڑھایا اور کئی بنگلہ ناولوں کے ترجمے کئے۔ قیصر شمیم نے بنگلہ افسانوں اور نظموں کو اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ ابراہیم ہوش، ناظر الحسینی، مصطفےٰ صابری، محمود ایوبی، منیر نیازی، راز عظیم اور رضوان اللہ علمی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو صحافتی دنیا کے لئے وقف کر دیا۔ پروفیسر رؤف نے انگریزی اور ترکی زبان کے کئی اچھے افسانے، مضامین اور نظموں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ ۶۶ء سے انہوں نے ڈیٹین کی نظموں کا باضابطہ منظوم ترجمہ کرنا شروع کیا۔ تقریباً دو سال کی مدت میں، انہوں نے متعدد نظموں کا ترجمہ کر لیا ...

کر دیا۔ جن میں سے کچھ ترجمہ نظمیں "والٹ وہٹ مین کی ۲۱ نظمیں" (سنہ ۱۹۶۹ء) اور "والٹ وہٹ مین کی ۳۱ نظمیں" (سنہ ۱۹۷۵ء) کے نام سے، کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ یہ سب نظمیں وہٹمین کی کتاب "لیوس آف گراس" LEAVES OF GRASS سے ماخوذ ہیں ——— ۔



عبدالرؤف

گزشتہ چند برسوں میں کچھ لوگ ابھر کے سامنے آئے ہیں، جن سے مستقبل میں کافی امیدیں وابستہ ہیں ان میں شمس الزماں، اقبال کرشن، راز عظیم، سید الابرار، تسکین انصاری، فیروز عابد، جمال غنی، حیدر صفت اور احسن شفیق وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شاعروں اور ادیبوں نے بھی بہت سی دوسری زبان کی تخلیقات کو اردو کا روپ دیا ہے۔

صحافت

بنگال نہ صرف اردو صحافت کی جنم بھومی ہے۔ بلکہ ہندوستان میں، انگریزی، فارسی، بنگلہ اور ہندی کی صحافت نے پہلی بار، یہاں جنم لیا۔ ہندوستان میں پہلا انگریزی کا اخبار جو شائع ہوا۔ اس کا نام بنگال گزٹ تھا۔ اس اخبار کو شائع کرنے کا شرف جیمس اگسٹس ہکی کو حاصل ہے۔ ہندوستان کے اس پہلے صحافی نے ہندوستان کو "خبر نامے" کے حدود سے نکال کر "اخباری دنیا" سے آشنا کیا۔ "بنگال گزٹ" عوام میں "ہکی گزٹ" کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اس اخبار کا پہلا شمارہ روز سنیچر، ۲۹ جنوری سنہ ۱۷۸۰ء کو شائع ہوا۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگلہ زبان نے صحافت کو سب سے پہلے گلے لگایا۔ بنگلہ کا پہلا اخبار "ڈگ درشن" (سنہ ۱۸۱۸ء) ہے۔ یہ روزنامہ تھا۔ اور بنگلہ کا پہلا ہفتہ وار "سماچار درپن" بھی اسی سال، سیرامپور سے شائع ہوا۔ ہندی کا پہلا اخبار "اودنت مارتنڈ" (سنہ ۱۸۲۶ء) کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے مدیر پنڈت جگل کشور تھے۔ اس طرح دیکھا جائے، تو اردو کا ہفت روزہ اخبار "جام جہاں نما" (۲۸ مارچ سنہ ۱۸۲۲ء)، جس کے مدیر ہری ہر دت تھے۔ وہ ہندوستان میں شائع ہونے والا، دوسرا اخبار ہے گویا اردو ——— ترقی کی دوڑ میں دیگر ہندوستانی زبانوں کی بہ نسبت، زیادہ تیز رو ثابت ہوئی

ہے ...



مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

ہے ـــــ اردو کا پہلا روزنامہ "اردو گائیڈ" (جنوری ۱۸۵۸ء) ہے۔ اس کے مدیر مولانا کبیرالدین احمد تھے۔ اس کے بارے میں گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ (۱۸۶۲ء) میں، یہ رائے دی ہے۔ "یہ بہت اچھا اخبار ہے اور اس کی اشاعت کثیر ہے" ـــــ مشترکہ بنگال میں، شہر ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کو بھی اردو صحافت میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں سے اردو کا پہلا اخبار "المشرق" ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے مدیر حکیم حبیب الرحمٰن تھے۔

بنگال کی سرزمین اردو ادب کے لئے سنگلاخ ضرور ہے مگر صحافت کیلئے بنجر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں سے بہت سے رسالے شائع ہوئے اور بند ہو گئے۔ ان کے بند ہونے کی بہت سی وجوہ تھیں۔ جن میں سرمایہ کی کمی اور چھپائی کی اجرت میں زیادتی اور اشتہارات میں کمی وغیرہ ـــــ یہاں سے ماضی میں، اردو کے متعدد اخبارات و رسائل شائع ہوئے ہیں۔ جن کا سراغ انیسویں صدی کے ابتدا ہی میں بخوبی ملتا ہے۔ "جام جہاں نما" (ہری ہر دت) نتیجۂ سخن (محمود وزیر علی) نور بصیرت (سید عبدالغفور شہباز) اردو گائیڈ (کبیرالدین بنگالی) الہلال و البلاغ (مولانا ابوالکلام آزاد) جمہوریہ، ہند، پیغام، عصر جدید اور مسلم گزٹ، حور، المومن اور جدید اردو نے اردو صحافت و ادب پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔

آزادی کے بعد بھی، یہاں سے متعدد اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ اور صحافت میں ان کی وجہ سے نمایاں ترقی ہوئی ـــــ کلکتہ، بنگال کا مرکزی شہر ہی نہیں بلکہ "دل" ہے۔ اور اردو صحافت کا مرکز بھی، یہی ہے۔ "جام جہاں نما" اور "الہلال" اس کے ماضی کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ صحافت کے میدان میں یہاں تسلی بخش ترقی ہوئی ہے۔ فی الوقت سات روزنامے آزاد ہند (احمد سعید ملیح آبادی) روزانہ ہند (رئیس الدین فریدی) عصر جدید (سفیان عالم) آبشار (ابراہیم ہوش) امروز (اقبال اکرامی) غازی (وقار مشرقی) رہبر عالم (ولی الاصغر ملک) شائع ہوتے ہیں۔ ہفتہ وار

آرزو ہند ...

آرزوئے ہند (جاوید حسن) کسان مزدور (محمد امین) تحریک ملت (عبدالعزیز) فلم ویکلی (وسیم الحق) عکاس (کریم رضا مونگیری) ہلال (شہزادہ سلیم براگ (جی۔ایم۔جگنو) اسپورٹس ٹوڈے (ارشد شکیل) پندرہ روزہ بخشیات (حکیم یوسف بخشی) ہوڑہ ٹائمز (شمس الدین) ماہنامے سدگل (حیدر علی) محرک (قیام انیس) حسن وصحت (حکیم زماں حسینی)۔ مشرقی ہند (جمال غنی)۔



احمد سعید ملیح آبادی

بنگال کی اردو صحافت کی نیک نامی کے لئے ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی و قاضی عبدالغفار کے نام ہی کافی ہیں۔ اس وقت ان صحافیوں کا تعاون، بنگال کی اردو صحافت کو حاصل ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی۔ آزاد ہند (کلکتہ) کے مدیر ہیں۔ آپ اردو کے مایہ ناز صحافی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے فرزند ہیں۔ صحافت آپ کو ورثہ میں ملی ہے۔ آپ نے اردو صحافت کو بنگال میں، ترقی دینے میں، اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی دو کتاب "اللہ کے گھر میں" اور "آج کا پاکستان" منظر عام پر آچکی ہیں۔ دونوں ہی کتابیں، موضوع کے اعتبار سے اہم اور مبسوط ہیں۔ ابراہیم ہوش۔ کہنہ مشق صحافی اور باکمال شاعر ہیں۔ آبشار (کلکتہ) کے مدیر ہیں ——— رئیس الدین فریدی۔ اچھے شاعر اور باکمال صحافی ہیں۔ روزنامہ ہند (کلکتہ) کے مدیر ہیں۔ آپ نے بنگال میں اردو صحافت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وقار مشرقی۔ مخلص اور اصول کے پابند انسان ہیں۔ کلکتہ کے عوامی روزنامہ "غازی" کے مدیر ہیں۔ منیر نیازی۔ اچھے صحافی اور شاعر ہیں۔ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ آزاد ہند (کلکتہ) سے وابستہ ہیں۔ اقبال اکرامی۔ کلکتہ کے مشہور اور پرانے صحافیوں میں ہیں۔ فی الوقت امروز (کلکتہ) کے مدیر ہیں۔ رئیس جعفری۔ مشہور صحافی ہیں، عصر جدید (کلکتہ) سے وابستہ تھے۔ اب 'عکاس' (ویکلی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہزادہ سلیم۔ بنگال کی اردو صحافت میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہفتہ وار عکاس ——— اور اب "ہلال" کے ذریعہ، اردو کی خدمت

کر رہے ...



شمس الزماں

کر رہے ہیں۔ شمس الزماں۔ شعلہ بیان مقرر، اچھے شاعر اور ذی قدر ادیب ہی نہیں، بلند پایہ صحافی بھی ہیں۔ آزاد ہند (کلکتہ) سے وابستہ ہیں۔ عبدالعزیز۔ ابھرتے ہوئے نوجوان صحافی اور اسلامی ادیب ہیں، "تحریک ملت" کے مدیر ہیں، جو علمی و مذہبی اخبار ہے۔ رضوان اللہ علمی۔ اچھے شاعر اور معزز صحافی ہیں۔ آزاد ہند (کلکتہ) سے وابستہ ہیں۔ سُفیان عالم۔ عصر جدید کے مدیر اور ابھرتے ہوئے صحافی ہیں۔ یوسف بخشی حکیم یوسف بخشی کا کلکتہ کی معزز علمی شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ "بخشیات" کے مدیر ہیں جمال غنی۔ ابھرتے ہوئے نوجوان صحافی ہیں۔ سماجی رسالہ، مشرقی ہند (کلکتہ) کے مدیر ہیں۔ قیام انیس اچھے افسانہ نگار اور ماہنامہ "محرک" (آسنسول) کے مدیر ہیں حیدر علی۔ بنگال کے معروف ادبی رسالہ "سبد گل" کے مدیر ہیں۔ دیگر صحافیوں میں عاجز انصاری، راقم لکھنوی، مصطفےٰ صابری، سجاد نظر، وسیم الحق، جسیم الحق، نظام الحسینی، محب الرحمٰن کوثر، بلیغ آسنولوی، شبنم برنپوری، محبوب انور، سہیل واسطی، مظفر عظیم آبادی، راز عظیم، محمد شبر، جلیل الدین شعلہ، فضل الرحمٰن، شمس الدین، محمد ادریس وغیرہ بھی اہم ہیں۔ راقم الحروف کا تعلق بھی تحریک ملت (کلکتہ) افلاک (آسنسول) سہیل (گیا) اور سبد گل (کلکتہ) سے رہا ہے۔

بنگال میں اردو کا جو سفر فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) سے شروع ہوا تھا۔ وہ آج بھی جاری ہے۔ ——— منزل کی طرف اردو ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کا قافلہ رواں دواں ہے جس سے ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ دوسرے صوبوں کی طرح بنگال میں بھی، اردو کو (آج کے سائنٹفک دور میں) دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کی کوشش جاری رہے گی، جو جلد یا بدیر کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ الغرض ہمارا ماضی تابناک تھا، حال کچھ دھندلا سا گیا تھا لیکن مستقبل ایک نئے سنہرے باب کی طرف نشاندہی کر رہا ہے۔